تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اردو

نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ

محقق:

عائشہ عنبرین

230FLL/MSURDU/F19

نگران:

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

شعبہ اردو (خواتین)

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلا آباد

Accession No. TH 25037

MS
891.4391
ن ۱۴

اردو ادب ـ شاعری
" ـ " ـ فکری اثرات
" ـ تاریخ سماجی

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Ayesha Ambreen**
Title of the Thesis: نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ
Registration No: 230-FLL/MSURDU/F19

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Incharge Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Aqlima Naz
Assistant Professor
Deptt. of Urdu, Fatima Jinnah Women University
Rawalpindi

Internal Examiner:

Dr. Sabahat Mushtaq
Lecturer, Department Of Urdu
Female IUII

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor, Department Of Urdu
Female IIUI

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عائشہ عنبرین رجسٹریشن نمبر 230-FLL/MSURDU/F19 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ" میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بیان حلفی

مسماۃ عائشہ عنبرین بنت محمد یعقوب اعوان رجسٹریشن نمبر 230-FLL/MSURDU/F19 شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں برائے MS URDU کی سکالر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقالہ بعنوان **''نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ''** نگران استاد، ڈاکٹر سائرہ بتول کے زیر سرپرستی مکمل کیا ہے۔ مسماۃ عائشہ عنبرین بنت محمد یعقوب اعوان اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا ہر قسم کے سرقہ سے پاک ہے۔ مسماۃ عائشہ عنبرین نے مقالہ ہذا کو کسی اور ڈگری کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ پیش کروں گی۔ ان تمام حقائق کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا۔ لہذا غلط بیانی کی صورت میں ہر قسم کی ذمہ داری مسماۃ پر عائد ہو گی۔

العبد

عائشہ عنبرین بنت محمد یعقوب اعوان

رجسٹریشن نمبر 230-FLL/MSURDU/F-19

شناختی کارڈ نمبر 61101-4059264-6

شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

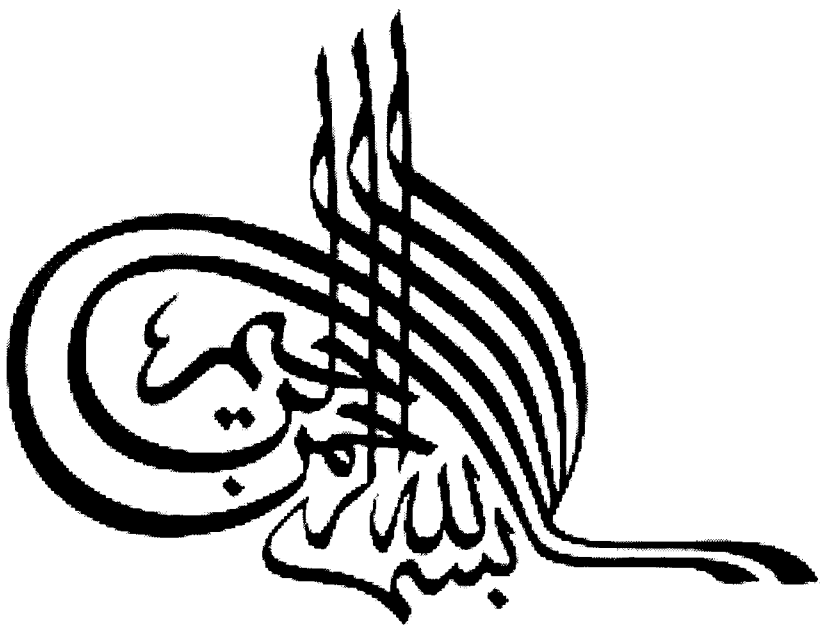
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

ہر نوع انسان کے لیے علم ہدایت و نور کا سر چشمہ ہے۔ انسان حصول علم کی خاطر نگر نگر گھومتا ہے۔ وہ لوگ نہایت ہی خوش نصیب ہیں۔ جنہیں ایسے مواقع میسر ہیں اور جو علم کی طلب و جستجو کے لیے کوشاں ہیں۔ ہم چاہے جتنا بھی علم سیکھ لیں لیکن اس کا پیالہ ہمیشہ تشنہ ہی رہتا ہے۔ اس کی بدولت نہ صرف انسان کے علمی، فکری اور شعوری استدلال میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ قوم و ملّت کی ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ اہل علم شخصیات ہمارے معاشرے کا اہم سرمایہ حیات ہیں انھی کی وجہ سے ہمارا معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں اردو ادب پر شیخ سعدی کے اثرات کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے اردو ادب کی ابتدا، اردو ادب کی ترویج و ترقی میں شاعری کا کردار، شیخ سعدی کا مختصر تعارف، نظر زیدی کی ترجمہ شدہ تصانیف حکایات بوستان سعدی اور حکایات گلستان سعدی سے تیار کردہ طریقہ تحقیق کو تحریر کیا گیا مزید بر آں اردو ادب میں سعدیؒ کی شخصیت و فن پر موجود کام ان میں تحقیقی مقالے، تصانیف (مرتب، ترجمہ)، اخبارات ورسائل میں موجود مضامین کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم میں نظیر اکبر آبادی کا مختصر تعارف، ان کی شخصیت و فن پر تحقیقی کام، تصانیف (مرتب، ترجمہ شدہ اور تاریخی کتب میں نظیر اکبر آبادی کے مضامین)، رسائل و روزنامہ میں ان کی مضامین کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعد ازاں نظیر اکبر آبادی کی منظومات پر شیخ سعدی کے سماجی، مذہبی و اخلاقی اثرات کو بیان کیا گیا۔

باب سوم میں غزل کا تعارف، نظیر کے ہم عصر شعراء اور غزل کا مختصر پس منظر کو پیش کیا۔ نظیرؔ چونکہ صرف نظم کی بدولت جانے جاتے ہیں جبکہ اس باب میں یہ بتایا کہ انھوں نے غزلیں بھی کافی تعداد میں لکھیں نیز نظیر اکبر آبادی کی غزلیات پر شیخ سعدی کے سماجی، مذہبی و اخلاقی اثرات کا جائزہ لیا گیا۔

باب چہارم میں نظیر اکبر آبادی کی منظومات میں محاکات اور منظر کشی کو زیر بحث لایا گیا۔ یعنی اس باب میں نظم اور محاکات کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے نظیرؔ کی منظومات کی روشنی میں یا یوں کہیے ان کی منظومات سے پیش کردہ مثالوں کی مدد سے محاکات اور منظر کشی کو بیان کیا گیا۔

باب پنجم میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے اسلوب کے اثرات کا تعین کیا گیا۔ یعنی اس باب میں اسلوب کیا ہے؟ کو بیان کرنے کے بعد، سعدیؒ کے دور کے حالات، توکل اور سادگی کی مثالیں پیش کیں اور یہی اثرات ہمیں نظیر اکبر آبادی کے ہاں نظر آتے ہیں۔ نیز سعدیؒ اور نظیرؔ کی سادہ بیانی کے حوالے سے دیگر مصنفین کی آراء کو بھی

تحریر کیا گیا۔ بعد ازاں سعدیؒ کی تاریخی اور اسلامی تلمیحات کے اثرات بھی نظیر اکبر آبادی کے ہاں نظر آتے ہیں اس کی بھی مثالیں پیش کی ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کی ترتیب و تکمیل کے سفر میں سب سے زیادہ مدد گار اللہ رب العزت کی بابرکت ذات ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جس کام کی تکمیل چاہتا ہے اس کے لیے پردہ غیب سے وسائل بھی مہیا فرما دیتا ہے۔ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ کام اس طرح پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ میں سب سے پہلے اس ذات کی شکر گزار ہوں۔ جس نے مجھ حقیر کو اس کام کو پایہ تکمیل تک پہچانے کی توفیق عطا کی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کے بعد میں اپنی استاد اور اس مقالے کی نگران محترمہ ڈاکٹر سائرہ بتول کی احسان مند اور شکر گزار ہوں جنھوں نے لحہ بہ لحہ مخلصانہ رہنمائی فرمائی اور نہایت مشفقانہ انداز اور خندہ پیشانی کے ساتھ موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک سارے مراحل میں میری اعانت کی۔ اس مقالے کو اس صورت میں مکمل کرنا ان کی رہنمائی کے بغیر ناممکن تھا۔ انھوں نے مصروفیت کے باوجود اپنے قیمتی وقت سے مجھے نوازا اور وقتاً فوقتاً میری رہنمائی کی۔ میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں محترم محمد سہیل شفیق جنھوں نے رسالہ معارف میں موجود تمام مضامین تک بآسانی رسائی کے لیے پی ڈی ایف لنک مہیا کیا۔ میں ان کی بھی مشکور ہوں۔ میں شعبہ اردو کی تمام اساتذہ اکرام کی بھی شکر گزار ہوں۔ جنھوں نے قدم قدم پر رہنمائی کی اور میری حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ہمت بھی بڑھائی۔

اس مقالے کی ترتیب و تکمیل میں بالخصوص والدین کی بھی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں۔ جو ہر لحہ میرے لیے دعا گو رہے۔ ان کی دعائیں ہمارے لیے نعمت ہیں۔ انھوں نے جس محبت، شفقت اور محنت سے مجھے علم کی روشنی سے منور کیا۔ میں آج جس مقام پر ہوں ان کی مہربانیوں اور دعاؤں کی بدولت ہوں۔ میں والدین کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کی شفقت کا سایہ اور دعائیں ہر لحہ میرے ساتھ رکھے، آمین! میں اپنی بہن (حفصہ جبین) اور بھائیوں کا بھی شکریہ ادا کرنا لازمی سمجھتی ہوں۔ انھوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور ہر ممکن مدد کی۔ آخر میں اپنی تمام دوستوں خاص طور پر بریرہ ہمدانی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جنھوں نے مجھے جب بھی ضرورت پڑی میری رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ مدد بھی کی۔ اس مقالے کی تیاری میں میرا مکمل ساتھ دینے کے علاوہ میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

عائشہ عنبرین

ستمبر ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	اردو ادب پر شیخ سعدی کے اثرات کا اجمالی جائزہ	۱
	حوالہ جات	۱۸
۲۔	**باب دوم:**	
	نظیر اکبر آبادی کی منظومات پر شیخ سعدی کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات	۲۲
	حوالہ جات	۴۵
۳۔	**باب سوم:**	
	نظیر اکبر آبادی کی غزلوں پر شیخ سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات	۴۸
	حوالہ جات	۶۶
۴۔	**باب چہارم:**	
	نظیر اکبر آبادی کی منظومات میں محاکات اور منظر کشی کا تجزیہ	۶۹
	حوالہ جات	۸۲
۵۔	**باب پنجم:**	
	نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے اسلوب کے اثرات	۸۴
	حوالہ جات	۱۰۰
	ماحصل	۱۰۳
	کتابیات	۱۰۸

باب اول:

اردو ادب پر شیخ سعدی کے اثرات کا اجمالی جائزہ

اردو ادب کی نشو و نما میں فارسی ادب نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان عربی، سنسکرت اور دوسری کئی زبانوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے لیکن اردو پر جس زبان کے سب سے زیادہ اثرات ہیں وہ فارسی زبان ہے۔ ہندوستان میں فارسی سات سو برس علمی و ادبی زبان رہی اور ساڑھے چھ سو برس سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ جبکہ اردو کے اوائل کے شعرا آتش، ناسخ اور ولی وغیرہ پر نظر ڈالیں تو وہ بھی فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ فارسی سے غزل گوئی کی روایت اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ فارسی کے اثرات اردو پر واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ہم اردو کی ابتدائی داستانوں پر نظر دوڑائیں تو یوسف زلیخا، لیلی مجنوں اور فارسی کی دیگر داستانیں اردو میں منتقل ہوئیں۔ اردو ادب پر فارسی کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ اردو شاعری کی بہت سی عروض و بحور بھی فارسی سے اردو میں آئی ہیں۔ باوجود اس کے آج اردو ادب اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند سے اردو زبان و ادب کی ابتداء ہوتی ہے۔ اردو زبان و ادب کے عروج و ترقی میں بہت سی اصناف (تحقیق، تنقید، تاریخ اور شاعری وغیرہ) نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جبکہ اردو شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری نے وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ اپنے موضوعات میں وسعت پیدا کی ہے۔ اردو کی ابتدائی شاعری جو درد و غم اور عشق و محبت تک محدود تھی۔ زمانے کی بدلتی کروٹوں کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں سماجی، اخلاقی اور معاشی مسائل کو موضوع بحث لایا گیا۔ مزید برآں بہت سی تحریکات و رجحانات (ترقی پسند تحریک، رومانوی تحریک اور ایہام گوئی وغیرہ) نے بھی اردو شاعری کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ابتداء سے دور حاضر تک نئے تجربات، نئے سانچے اور فن و فکر کے بدلتے رجحان کی وجہ سے اردو شاعری کے میدان میں وسعت پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کی بدولت اردو ادب کی ترویج و ترقی میں اضافہ ہوا ہے۔

شاعری کا عام مفہوم دلی جذبات و احساسات کی عکاسی اور کیفیات کا اظہار یہ ہے۔ اردو لغت میں شاعری کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ۔ "فنون لطیفہ کی ایک شاخ یا وہ منظوم ادب پارہ جو ردیف، قافیہ اور بحر کے التزام یا بغیر اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہو۔"[1] یعنی شاعری فن لطیف کی ایک شاخ ہے۔ اس میں ردیف اور قافیہ پیمائی کے ساتھ شاعر کے تخیلات کا بیان موجود ہوتا ہے۔ جہاں اردو شاعری کی تعریف و توضیح سے متعلق ادب میں متعدد کتب اور مضامین شائع ہوئے وہاں اس پر مختلف حوالوں سے تنقید بھی کی گئی کلیم الدین احمد کی تصنیف

اردو شاعری پر اک نظر کے مقدمہ میں محمد فضل الرحمن، اردو لغت کی بیان کردہ تعریف کے برعکس اردو شاعری کے بارے میں یہ کہتے نظر آئے کہ:

> شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں۔ ایک فن، ایک صناعی بھی ہے۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے حسیات و تخیلات، ولولوں اور امنگوں، اپنے تجربات زندگی کو ایک تعمیری عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اسے زبان میں تناسب، موزونیت اور توازن کا اسی قدر خیال رکھنا ہوتا ہے جیسا کہ ایک بت تراش کو مجسمہ بنانے میں، اس لیے درحقیقت عروض و بحور، استعارات و قوافی اور دیگر لوازمات شاعری اہم ضرور ہیں۔ لیکن یہ سب ذرائع ہیں منزل مقصود تک پہنچنے کے۔[۲]

اس اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو محمد فضل الرحمن نے اردو شاعری کی تعریف جذبات و احساسات کے اظہار بیان سے ہٹ کر کی اور کہا کہ شاعری فن، تخیلات، احساسات اور تجربات کا نام ہے۔ شاعر کو قافیہ، ردیف بحر اور استعارے کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ شعر کی معنویت اور وزن کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں پرویز احمد اعظمی نے اپنی تصنیف اردو میں سیاسی شاعری کی ادبی قدر و قیمت (۱۹۵۰ء-۱۹۰۰ء) میں کہا کہ جمیل جالبی نے مغربی نقاد ہوریس کی شاعری کے متعلق رائے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "ہوریس خوش ذوقی کو شاعری کے لیے ضروری بتاتا ہے اور فن شاعری میں اسی اصول کی تشریح کرتا ہے۔ خوش ذوقی فن کی وحدت سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی فن کا وہ مجموعی اثر جو ایک مکمل شکل سے پیدا ہوتا ہے۔"[۳] یعنی ہوریس نے شاعری کے فن کے لیے خوش ذوقی کو اہم قرار دیا ہے۔ ایسے میں دیکھا جائے تو سنبل نگار نے اپنی تصنیف اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ میں کہا کہ شبلی کے نزدیک شعر نہ صرف جذبات و احساسات کا نام ہے۔ بلکہ شعر وہ ہے جو قاری کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کو بھی متحرک کرے۔[۴] یوں دیکھا جائے تو شاعری جذبات و احساسات، فن، تجربات اور بحر و عروض کے اظہار خیال کا نام ہے۔

اردو ادب میں شاعری کی ابتداء امیر خسرو☆ سے ہوتی ہے۔ گو کہ ان سے قبل مسعود سعد سلمان لاہوری کا نام بھی لیا جاتا ہے مگر ان کے متعلق تاریخ میں کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اردو شاعری کا آغاز دکن سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ دہلی اور لکھنؤ جا پہنچتا ہے۔ دکن میں یہ عہد تین ادوار میں تقسیم ہے۔ اوّل بہمنی دور، اس دور میں میراں جی شمس العشاق، بندہ نواز گیسو دراز اور فخر الدین نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔ دوم عادل شاہی دور، اس کے اہم شعراء جنہوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا ان میں برہان الدین جانم، نصرتی، ہاشمی اور عادل شاہ کے نام اہم ہیں۔ سوم قطب شاہی دور، اس عہد میں ملا وجہی، قلی قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی نے شاعری کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ بعد ازاں اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ آتا ہے۔ ان کے دور کے آخر میں ولی پیدا ہوئے

اور ۱۷۲۲ء میں ریختہ کا دیوان دہلی لے آئے یوں اردو شاعری کا رجحان دہلی میں پھلا پھولا۔ دہلی میں سراج الدین خاں آرزو، مضمون، شاکر ناجی، آبرو، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ حاتم، اشرف علی فغاں بعد ازاں سودا، میر تقی میر، میر سوز اور میر درد نے غزل کو وسعت دی۔ یہ سلسلہ یہاں نہیں روکا بلکہ شاہ نصیر، آتش، ذوق، غالب اور مومن نے شاعری کے رجحان کو مزید تقویت بخشی۔

اردو شاعری کے آغاز کے متعلق جہاں مختلف شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں اردو شاعری کے بدلتے رجحانات کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ اردو شاعری سے ناانصافی ہو گی۔ اردو شاعری مختلف موضوعات کا مرقع ہے۔ یوں اردو زبان و ادب میں شاعری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہو گا کہ سنجیدہ اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے پہلو بہ پہلو حقیقت پسندانہ اور عوامی زندگی کے موضوعات پر بھی شاعری کی گئی ہے۔ اس کی واضح مثال نظیر اکبر آبادی کی شاعری ہے اور ہر عہد میں اس نوع کے شاعر مل جاتے ہیں۔ اردو ادب کی ترقی میں شاعری نے اہم کردار ادا کیا۔ اس میں نئے جذبے اور رویے کا خیر مقدم کیا گیا۔ یعنی درد و غم، زندگی کی ہماہمی، امید و یاس، زندگی جینے کا جوش و جذبہ، جستجو و آرزو، سوز و ساز اور تلخیوں کا بیان وغیرہ کو موضوع سخن لایا گیا۔ ابتدائی ادوار میں شاعری کے موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی تھی مگر دور حاضر میں وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ شاعری کی صنف میں تبدیلی آئی۔ یوں شاعری میں سیاسی، سماجی، معاشی اور تصوف جیسے موضوعات کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مندرجہ بالا سطور میں اردو ادب میں شاعری کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے اردو شاعری کے بدلتے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے مگر ہمارا اصل مقصود اردو ادب پر شیخ سعدی کے اثرات کا جائزہ لینا ہے۔

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی درویش اور صوفی منش انسان تھے۔ ان کی ولادت ۵۸۹ھ بمطابق ۱۱۹۳عیسوی لکھی۔[5]☆ آپ کی تمام عمر درویشی و عبادت میں گزری اور آپ کی دو تصانیف گلستان و بوستان کو بے حد شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس دور میں فارسی زبان کا بول بالا تھا۔ اس لیے یہ دونوں تصانیف فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ مگر آج تقریباً دنیا کی ہر زبان میں گلستان و بوستان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی دیگر تصانیف میں " بوستان "، "گلستان"، "کریما"، "قصائد عربی و فارسی"، "تصوف میں چند مسائل"، "جزائر افریقہ (۴ جلدیں)"، دیوان غزلیات (۳جلدیں)"، "قطعات" اور "رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ سعدیؒ نے اپنے آبائی شہر (شیراز) میں علم و حکمت کے کئی سال گزارے۔ ان کی تربیت اعلیٰ سطح پر کی گئی یہی وجہ ہے کہ گلستان و بوستان آگے چل کر سب کے لیے مشعل راہ بنیں اور آپ نے سیر و سیاحت کی بدولت مختلف ملکوں کا سفر کیا ان میں شام، عراق، ہندوستان، مصر، کاشغر، عرب، حلب، روم اور یروشلم وغیرہ کا سفر شامل ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے حیات سعدی کے نام سے سوانح عمری لکھ کر ان کو صحیح معنوں میں اردو ادب سے روشناس کروایا۔ یوں

اردو ادب میں سعدیؒ کی حکایات سے حکمت و دانائی، عدل و انصاف، صبر و تحمل اور اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان سے استفادہ کیا گیا۔

شیخ سعدی اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک تھے۔ آپ کی تصانیف گلستان و بوستان اخلاقی تعلیمات کا بہترین نمونہ ہیں۔ سعدیؒ کی یہ خوبی تھی کہ ان کی کتب میں موجود اخلاقی و سماجی، روحانی و مذہبی حکایات نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ سعدیؒ نے یہ کتب اس عہد میں لکھیں۔ جب انسان اپنے اوپر دنیاداری اور خود غرضی کا لبادہ اوڑھ چکے تھے ۔انھوں نے اس وقت اس طرح کی کتب لکھ کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ بعد ازاں یہ معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی کا باعث بنی۔ گلستان و بوستان کے مقبول عام ہونے کی ایک وجہ اس کی سادہ بیانی بھی ہے۔ انھوں نے اپنے انداز نگارش میں سلاست و روانی، فصاحت و بلاغت، صنائع بدائع اور خوبصورت استعارات کا استعمال کر کے تحریر کو پر مغز اور پر لطف بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

زیر نظر تحقیق میں "نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ" کیا گیا ہے۔ یہ تحقیقی کاوش نظر زیدی کی ترجمہ شدہ کتابوں حکایات گلستان سعدی اور حکایات بوستان سعدی کے سماجی و اخلاقی اقدار کے فریم ورک کے تحت کی گئی۔ مجوزہ تحقیق میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات پر سماجی و اخلاقی اقدار کے فریم ورک کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کے عناصر درج ذیل ہیں ۔

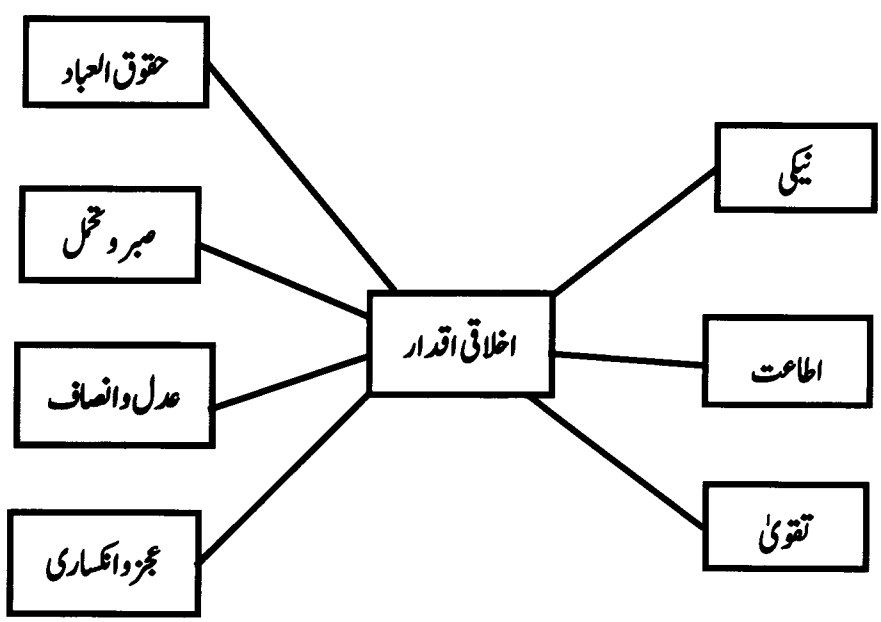

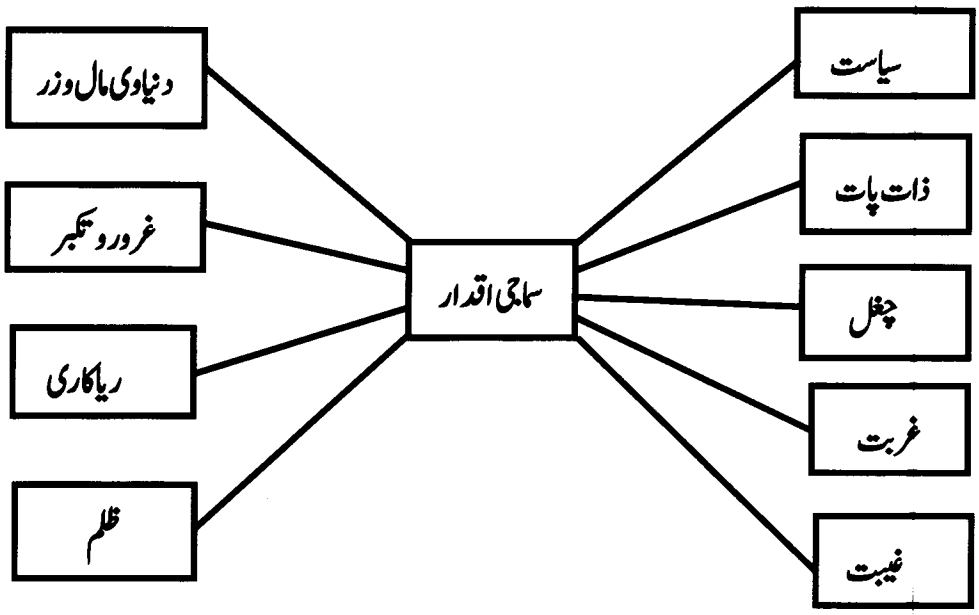

اردو ادب میں اخلاقی پہلوؤں کو زیر بحث لاتے ہوئے سعدیؒ کی حکایات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ان کا کلام اخلاقی اعتبار سے دلچسپ اور نصیحت آموز ہے۔ ان کے اخلاقی اوصاف میں حقوق العباد، عفو و درگزر، مساوات، صبر و تحمل، قناعت و توکل، عدل و انصاف، درویشی، حق و صداقت، زہد و تقویٰ اور توحید وغیرہ کو موضوع سخن لائے ہیں۔ یہ تمام اوصاف سعدیؒ کی حکایات و شعری کلام میں ہمیں جابجا نظر آتے ہیں۔ جو ان کی تحریر کو دلچسپ اور دلکش بنانے میں ممد و معاون ہیں۔ اردو ادب میں سعدیؒ کی اخلاقی تعلیمات کے اثرات مختلف شعراء کے ہاں نظر آتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو سعدیؒ نے درویشی و حکمت کو اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

نہ با شتر بر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم — نہ خدا وند رعیت نہ غلام شہر یارم
نہ میں اونٹ پر سوار ہوں نہ اونٹ کی طرح بوجھ میں دبا ہوا — نہ رعیت کا بادشاہ ہوں، نہ بادشاہ کا غلام
غم موجود و پریشانی معدوم ندارم — نفسے میزنم آسودہ و عمرے بسر آرم
مجھے نہ موجود کا غم اور نہ معدوم کی پریشانی — آرام سے سانس لیتا ہوں اور عمر گزارتا ہوں[5]

ایک طرف جہاں سعدی کے کلام میں ہمیں درویشی و فقیری کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ وہیں اردو ادب میں بھی بعض شعراء کے ہاں یہ اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کا شعر ملاحظہ ہو:

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے

خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے[6]

اقبالؒ کی شاعری پر سعدیؒ کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ سعدیؒ کی شاعری میں فقیری و درویشی کے علاوہ تصوف و معرفت بھی ان کے کلام میں اہم جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

اندروں از طعام خالی دارد — تا در و نور معرفت بینی
پیٹ کو کھانے سے خالی رکھ — تاکہ اس میں معرفت کا نور تجھ کو نظر آسکے
تہی از حکمتی بعلت آں — کہ پری از طعام تابینی
تو حکمت سے اس سبب سے خالی ہے — کہ کھانے سے ناک تک بھرا ہوا ہے[7]

تصوف اور معرفت کے یہی اثرات ہمیں میر تقی میر اور میر درد کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

میر تقی میر:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے [8]

میر درد:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں [9]

سعدیؒ کے کلام میں جہاں درویشی و فقیری، تصوف و معرفت کا بیان موجود ہے اسی طرح ان کی شاعری میں توکل کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ توکل کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

جہاں اے برادر نہ ماند بہ کس — دل اندر جہاں آفریں بندو بس
اے بھائی دنیا کسی کے ساتھ نہیں رہے گی — دل خدا سے لگانا چاہیے باقی کچھ نہیں
مکن تکیہ بر ملک دنیا و پشت — بسیار کس چو تو پرور دو کشت
دنیا کے ملک پر بھروسہ نہ کر اور اسکے سہارے نہ رہ — کیونکہ دنیا نے بہت سے تجھ جیسے پرورش کیے اور مار ڈالے
چو آہنگ رفتن کند جان پاک — چہ بر تخت مردن چہ بروئے خاک

جب پاک جان جانے کا ارادہ کرے تو خاک اور تخت پر مرنا دونوں برابر ہے[10]

سعدیؒ کی شاعری میں توکل کی تلقین کی گئی ہے جس کی واضح مثال اوپر پیش کی گئی ہے۔ یہی اثرات ہمیں نظیر کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ زر سیم لعل در کو تو بارے اسی سے مانگ
صندوق مال دھن کے پٹارے اسی سے مانگ
پیسا بھی مانگنا ہے تو جارے اسی سے مانگ
کوڑی بھی مانگنی ہے تو پیارے اسی سے مانگ
غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی ل دلائے [11]

اردو ادب پر سعدیؒ کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ سعدیؒ کے درویشی، مساوات، حق و صداقت، توکل اور تصوف نے اردو شعراء کو متاثر کیا ہے۔

اردو ادب میں سعدیؒ پر مختلف حوالوں سے تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ نہ صرف تحقیقی سطح پر بلکہ رسائل و جرائد میں بھی ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر مقالات تحریر ہو چکے ہیں۔ شیر محمد بزدار نے ڈاکٹر اسلم حیات درانی کے زیر نگرانی اقبال اور سعدی کا فلسفہ اخلاق تحقیقی جائزہ، ایم۔ فل کا تحقیقی مقالہ سن ۲۰۰۴ء میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اس مقالے کے کل سات ابواب ہیں اور ان کے ذیلی عنوان بھی ہیں۔ اس مقالے کا بنیادی مقصد اخلاقی اقدار کو پیش کرنا تھا۔ اس مقصد کو بیان کرنے کے لیے مقالہ نگار نے سعدی کے حالات زندگی، مذہبی و سیاسی حوالے سے اور ان کے فلسفہ اخلاق پر کھل کر بحث کی ہے۔ شیر محمد بزدار نے سعدیؒ کی اخلاقیات کے متعلق کہا کہ "شیخ اپنے فلسفہ اخلاق میں اخلاقی اقدار کا علم دار اور محافظ ہیں۔ وہ اخلاق کریمانہ کا حامل باصفا درویشوں کو سمجھتے ہیں۔"[12] شیخ سعدی کا کام فلاح انسانی، لوگوں کو نیکی و بدی کا شعور دینا اور قوم کی اصلاح کرنا تھا۔ اور گلستان و بوستان اس کی خوبصورت مثال ہیں۔ ان دونوں تصانیف میں ہمیں ان کے اخلاقی اقدار کا حقیقی عکس دکھائی دیتا ہے۔ سعدی شیرازی نے اچھے اور برے اخلاق میں تمیز کی ہے اور اسی حوالے سے شیر محمد بزدار لکھتے ہیں:

> نظریہ اخلاق میں شیخ سعدی کے نزدیک اچھا اخلاق آفاقی حقیقت (universal truth) ہے۔ جو ہر جگہ پسندیدہ ہے۔ برا (بہیمانہ) اخلاق ہر مہذب معاشرہ میں ناپسندیدہ اور تنقید کا نشانہ بنتا ہے۔[13]

سعدیؒ کی معرکتہ لآراء تصانیف گلستان و بوستان در حقیقت اعلیٰ اخلاق کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی حکایات اخلاقیات کا بہترین درس دیتی ہیں اور شیر محمد بزدار نے بھی اس تحقیقی مقالے میں اقبال اور سعدیؒ کے فلسفہ اخلاق پر مفصل بحث کی ہے۔ اردو ادب میں محض اسی ایک مقالے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ رسالہ معارف کے مختلف سنین میں بھی سعدیؒ کی زندگی کے چند ایک پہلوؤں پر مقالات تحریر کیے گئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

پروفیسر نذیر احمد نے جلد ۱۳۱، جون ۱۹۸۳ء میں "سعدی شیرازی کی ولادت کے سلسلہ کی چند داخلی شہادتوں کا جائزہ" کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے سعدی شیرازی کی مستند تاریخ پیدائش کے لیے مختلف ذرائع کو اختیار کیا ہے۔ ان میں زماں و مکاں کا تعین، تاریخی واقعات و شخصیات اور حکایات کی روشنی میں اصل تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔ نذیر احمد نے اپنے مقالے میں شیخ سعدی کی پیدائش کے متعلق دو طرح کی داخلی شہادتیں پیش کی ہیں۔ اوّل شیخ سعدی شیرازی کی ولادت ساتویں صدی کے اوّائل میں ہوئی۔ دوّم چھٹی صدی کے آواخر میں ہوئی۔ مقالہ نگار نے مختلف شخصیات اور واقعات کی روشنی میں چھٹی صدی کے آخر میں شیخ سعدی کی پیدائش کو رد کیا اور وہ لکھتے ہیں:

> سعدی کے کلام میں کسی ایسے ممدوح کی مدح نہیں جو ساتویں صدی ہجری کے قبل کا ہو، ان کے مخصوص مدوحین میں شیراز کے فرماں روا تھے، ان میں اتابک ابو بکر بن سعد بن زنگی (م ۶۵۸)، اتابک سعد بن ابو بکر سعد (م، ۶۵۸)، محمد بن سعد بن ابو بکر (۶۵۸ تا ۶۶۰)، سلجوق شاہ ابن سلغر (۶۶۱ تا ۶۶۳)، آبش خاتون دختر سعد بن ابو بکر منکوحہ تیمور ہلاکو (۶۶۲ تا ۶۶۳) قابل ذکر ہیں۔ [۱۴]

اقتباس کی روشنی میں اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعدیؒ کی پیدائش ساتویں ہجری میں ہوئی۔ نذیر احمد نے مزید داخلی شہادتیں بھی گردانی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں جیسے محمد خوارزم کا قصہ سناتے ہوئے شیخ سعدی کی تاریخ پیدائش ۵۶۶ھ بتاتے ہیں پھر آذربائیجان کے آخری بادشاہ اتابک اوزبک (۶۰۷ تا ۶۲۲) کے غلام اغلمش کی تاریخی فتوحات اور حکمرانی کا ذکر کرتے ہوئے سعدیؒ کی پیدائش ۵۸۰ھ کو قرار دیا۔ بعد ازاں ان کا یہ کہنا تھا کہ ان ذرائع سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے لہذا مقالے کے آخر میں لکھتے ہیں: "میرے خیال میں سعدی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے کی دو مختلف آراء کے درمیان مفاہمت بغیر مزید شواہد کے ممکن نہیں، موجودہ شہادت کی روشنی میں یہ مسئلہ حل پذیر نہیں ہو سکتا اور اب تک اسی سلسلے کی ساری کوششوں میں کوئی کوشش قابل قبول قرار نہیں دی جا سکتی۔ "[۱۵] علاوہ ازیں پروفیسر نذیر احمد نے اس رسالے میں اپنا ایک اور مقالہ " کچھ سعدی شیرازی کے بارے

میں" کے موضوع کے تحت جلد ۱۴۳، مئی ۱۹۸۹ء میں لکھا ہے۔ اس میں سعدی شیرزی کے حالات زندگی کے متعلق کئی ایک پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ نیز ان کے کلام کی تعریف کے ساتھ ساتھ گلستان و بوستان کی شہرت و مقبولیت اور سعدی شیرازی کی شخصیت کے متعلق دیگر باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ابتداء سے دور حاضر تک سعدی کی شہرت و مقبولیت قائم و دائم ہے۔ سعدی کے نام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ان کے اصلی نام کے بارے میں کئی اختلاف ہے، مشرف الدین، شرف الدین، مصلح الدین بتائے جاتے ہیں۔ ۷۱۸ کے نسخے میں مشرف الدین مصلح السعدی، کابل کے ۷۲۶ والے نسخے میں بھی مشرف الدین مصلح ہے۔ انڈیا آفس کے ۷۲۸ والے نسخے میں مشرف بن مصلح السعدی کئی جگہ آیا ہے۔ علی گڑھ کے ۸۱۴ والے مخطوطے میں مصلح الدین سعدی اور ۸۲۴ ھ کے سبز پوش کے مخطوطے میں شیخ مشرف الدین سعدی، حیات سعدی میں شرف الدین ہے۔[۱۶]

مقالہ نگار کا یہ خیال بجا ہے کہ سعدیؒ کا مستند کلام سامنے لایا جائے۔ مختلف واقعات کا بیان کرتے ہوئے سفر سومنات اور کریما کی تصنیف وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے اور اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ گلستان و بوستان کے قابل بھروسہ تراجم کروائے جائیں تاکہ قوم اس سے مستفید ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ نذیر احمد نے اس دکھ کا اظہار کیا ہے کہ شیخ سعدی جیسی شخصیت جو پوری دنیا میں اپنا ایک الگ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں ان پر بہت کم کام دستیاب ہے۔

سید سلیمان ندوی کو اردو ادب سے خاص شغف تھا۔ اردو ادب میں سید سلیمان ندوی کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو آپ نے سیرت النبی حصہ سوم تا ششم، عرب و ہند تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام، حیات شبلی، سیرت عائشہ، نقوش سلیمانی، خطبات مدارس اور شعری مجموعہ ارمغان سلیمانی جیسی تصانیف لکھ کر اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ بعد ازاں معارف جیسے رسالے سے بھی وابستہ رہے۔ اسی سلسلے کے دوران سید سلیمان ندوی نے "سعدی کا "سرائے اغلمش" کے عنوان سے ایک مقالہ جلد ۳۱، فروری ۱۹۳۳ء میں لکھا ہے۔ سید سلیمان ندوی کو دوران مطالعہ سعدیؒ کی تصنیف گلستان سعدی میں موجود لفظ "اغلمش" نے بے چین کیا۔ مقالے کا مقصد لفظ "اغلمش" کی جانچ پرکھ اور مبہم معنی کی تلاش و جستجو تھی۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ "اغلمش" کا تعلق نہ ہی کسی شاہی خاندان سے ہے اور نہ ہی التمش" (سلطان دہلی) سے ان کو منسوب کرنا درست ہے۔ سید سلیمان ندوی آذربائیجان کے بادشاہ اوزبک بن پہلوان اور جلال الدین اسماعیلی کا قصہ سناتے ہوئے لفظ "اغلمش" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اوزبک بن پہلوان شاہ آذربائیجان کے بھائی کا ایک لائق غلام اغلمش نام تھا، جو سلطان علاء الدین

محمد خوارزم شاہ کے پاس گیا تھا، وہ اسی وقت وہاں سے واپس آیا تھا، اور لڑائی میں اس نے دلیرانہ حصہ لیا تھا، اس لیے اوزبک بن پہلوان نے اپنے خلیفہ کے مفتوحہ حصہ مملکت پر اس کو حکمران بنادیا۔[۱۷]

اس مقالے میں سید سلیمان ندوی نے یہ جاننے کی بھرپور کوشش کی کہ سعدی شیرازی نے اپنی حکایت میں لفظ "اغلمش" کا استعمال کس شخص کے لیے کیا ہے؟ بعد ازاں انھوں نے اپنے انداز نگارش کی مدد سے آگاہ کیا ہے کہ "اغلمش" ایک غلام تھا اسے اپنی لائقی کی بدولت اصفہان اور ہمدان مملکت کا حکمران (۶۱۲ھ بادشاہ) بنایا گیا تھا۔ مختصراً یہ کہ مقالہ نگار نے لفظ "اغلمش" کے اصل مطلب تک پہنچنے کی کھوج لگائی اور قارئین کو مفید معلومات فراہم کیں۔

ڈاکٹر منیر احمد خاں نے جولائی ۲۰۰۳ء میں "کلام سعدی میں احادیث کی تلمیحات" پر مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں منیر احمد نے سعدی شیرازی کی گلستان، بوستان اور کریما تینوں تصانیف میں موجود احادیث کی تلمیحات کو پیش کیا ہے۔ سعدی شیرازی کی تصانیف گلستان، بوستان اور کریما میں سے ایک ایک مثال کا ذکر کرتی چلوں۔ گلستان میں ایک شعر ہے:

؎ آتش سوزاں نہ کند یا سپند
آں چہ کند دودِ دلِ مستمند [۱۸]

من دعا علی من ظلمہ فقد انتصر[۱۹]

"جس شخص نے اپنے ظلم کرنے کے واسطے (بد) دعا کی اس نے ضرور بدلہ لے لیا"۔

اسی طرح سعدی شیرازی کی تصنیف "بوستان" کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

؎ زمین از تب لرزہ آمد ستوہ
فرو کوفت بردا منش میخ کوہ [۲۰]

لما خلق اللہ الارض جعلت تمیدفارساھا بالجبال فاستقرت[۲۱]

"جب خدا نے زمین کو بنایا تو وہ ہلتی اور کانپتی تھی، پس خدا نے اس پر پہاڑ گاڑ دیے اور وہ قرار پکڑ گیا"۔

کریما کا ایک شعر ہے:

؎ تواضع زیادت کند جا ہ را

کہ از مہر پر توبود ماہ را[۲۲]

ما نقص مال من صدقۃ وما زادالله عبدا بعفواً عزّا ولا تواضع عبدالله الا رفعه الله [۲۳]

"خیرات دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور جو آدمی درگذر کرتا ہے خدا اس کی عزت میں افزونی کرتا ہے اور جو آدمی محض خدا کی خوشنودی کے لیے تواضع کرتا ہے خدا اس کا رتبہ بڑھاتا ہے"۔

منیر احمد خاں نے اپنے اس مقالے میں تینوں تصانیف میں سے ۴۵ تلمیحات کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند ایک کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔

شیخ فرید نے بھی رسالہ معارف جلد ۱۰، اگست ۱۹۵۷ء میں "سعدی دکنی کا وطن اور ان کے بعض نئے اشعار" کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا ہے۔ سعدی شیرازی کے بارے میں دیگر مصنفین، تذکروں اور تواریخ کی روشنی میں ان کے دکنی اور کاکوروی وطن سے تعلق کی وضاحت کی۔ سعدی کے وطن کے متعلق دو طرح کے گروہ ہیں اوّل دکنی ،دوم کاکوروی۔ پہلے گروہ میں مصنفین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے سعدی کو دکنی کہا ان میں مولوی عبدالحق، سید فتح علی خاں گردیزی دہلوی، میر حسن دہلوی، لچھمی نراین، شفیق اورنگ آبادی اور سید نصر الدین صاحب ہاشمی شامل ہیں۔ دوسرا گروہ انھیں کاکوروی مانتا ہے۔ ان مصنفین میں حامد حسن قادری، اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی شامل ہیں۔ پروفیسر فرید لکھتے ہیں:

> سید شمس الدین صاحب قادری نے تاریخ زبان اردو میں نکات الشعراء اور مخزن نکات سے سعدی کے پانچ ابیات نقل کر کے قائم چاند پوری، میر تقی میر اور سید فتح علی گردیزی کے تذکروں سے اقتباسات نقل کیے ہیں اور ملا نظام الدین کی تصنیف طبقات اکبری کے حوالہ سے سعدی کو کاکوروی بتلایا ہے۔ [۲۴]

مزید یہ کہ پروفیسر فرید نے سعدی شیرازی کے نئے اشعار کے متعلق مختلف مصنفین، بیاضوں اور تذکروں کی روشنی میں بحث کی اور آخر میں لکھتے ہیں: "مختصر یہ کہ سعدی نے شیر وشکر کی آمیزش سے ریختہ کے صفحات پر جو موتی بکھیرے ہیں ان کی آب وتاب نمایاں اور قدامت مسلّم ہے، سعدی کے "میٹھے بول" شہد وشکر سے زیادہ شیریں ہیں۔" [۲۵] یعنی سعدیؒ کے انداز نگارش میں شیرینی پائی جاتی ہے جو ان کی شخصیت کے وقار اور شجاعت میں نمایاں حیثیت ادا کرتی ہے۔

رام لعل نابھوی نے جنوری ۱۹۹۲ء، کیا شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے؟ کے عنوان کے تحت مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں دیگر مصنفین کی آراء کی روشنی میں یہ جاننے کی بھرپور کوشش کی کہ آیا سعدی شیرازی ہندوستان آئے

بھی تھے یا نہیں؟ مولانا الطاف حسین حالی، پروفیسر نذیر احمد، منشی گوبند رام، پروفیسر جلال متنی، منشی احمد حسین، ڈاکٹر اختر راہی اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ کی دیگر کتب اور مضامین کی روشنی میں سفر سومنات پر مفصل بحث کی ہے۔ رسالہ صمصام ہند، تاریخ فرشتہ اور مغل پینٹنگز (ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) وغیرہ سے بھی مدد لی ہے۔ کیا سعدی شیرازی ہندوستان آئے تھے؟ رام لعل نابھوی نے اس بحث طلب سوال پر متعدد فرمودات وارشادات کو قلم بند کیا اور ڈاکٹر اختر راہی کے مضمون سے اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بوستان سے سومنات اور ہندوستان کے سفر کی موہوم اطلاع سے آگے بڑھ کر دہلی میں شیخ سعدی کی آمد کی روایت بھی بیان کی گئی ہے اور مقصد سفر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ امیر خسرو سے ملنے آئے تھے۔ حیرت ہے کہ شیخ سعدی جیسا شاعر دہلی آئے اور معاصر مورخین اس کے بارے میں خاموش رہیں۔ حتٰی کہ جس شخص کی کشش انھیں دہلی کھینچ لائے وہ دنیا بھر کی اطلاعات دینے کے باوجود اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہ لکھے۔[۲۶]

محمد اعجاز حسن نے دسمبر ۱۹۳۲ء میں شیخ سعدی کا تخلص کس "سعد" کے نام پر ہے؟ کے عنوان کے تحت مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں اعجاز حسن نے سعدیؒ کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تخلص پر مفصل بحث کی ہے۔ اور یہ بحث اس دور کے حالات وواقعات، تاریخی شخصیات، زماں ومکاں کے تحت کی گئی۔

اردو ادب میں سعدیؒ کی شخصیت وفن کے حوالے سے نہ صرف رسالہ معارف میں مقالات تحریر کیے گئے بلکہ کئی کتب بھی سامنے آچکی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جامع ومانع اور نہایت معروف تصنیف مولانا الطاف حسین حالی نے سن ۲۰۱۱ء میں " حیات سعدی " کے نام سے لکھی۔ الطاف حسین حالی نے سعدیؒ کی زندگی پر سوانح لکھ کر انھیں اردو ادب میں دائم کر دیا۔ حالی کی تصنیف کا مختصر جائزہ لیا جائے تو وہ دو ابواب پر مشتمل ہے اوّل سعدی کی سوانح عمری، دوّم سعدیؒ کی شہرت وتصانیف کا ذکر کیا ہے۔ حالی کی تصنیف پر بہت سے لوگوں نے اعتراضات اٹھائے اور تنقید بھی کی ہے باوجود اس کے حیات سعدی نے ہر خاص وعام کو بہت سی مفید ودلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے باب اوّل میں سعدی شیرازی کی پیدائش، فارس وشیراز کا حال، ولادت اور سیر وسیاحت کا خوبصورت انداز سے تذکرہ کیا ہے۔ چوں کہ سعدیؒ کو سیر وسیاحت کا شوق تھا اس لیے حالی ان کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شیخ کے سفر جس قدر گلستان وبوستان سے ثابت ہوتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراساں، ترکستان اور تاتار تک گیا ہے اور بلخ وکاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے۔ جنوب میں

سومنات تک آیا اور ایک مدت تک وہیں ٹھہرا رہا۔۔۔ شمال و مغرب کی طرف عراقِ عجم، آذر بائیجان، عراقِ عرب، شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک میں بارہا اس کا گزر ہوا ہے۔[۲۷]

مولانا الطاف حسین حالی کے اس اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سعدی شیرازی نے بے شمار سفر کیے تھے۔ سیر و سیاحت کا عمل ہر شخص کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوتا ہے کیوں کہ دوران سفر انسان بہت سے حالات و واقعات سے دوچار ہوتا ہے انھی تجربات کی بدولت انسان کے عقل و فہم اور شعور میں پختگی آتی ہے۔ حالی نے اپنی تحریر (حیات سعدی) کی روشنی میں سعدی شیرازی کے دیگر شہروں کے سفر کی داستان بیان کی ہے۔ اوپر بیان کردہ شہروں کے علاوہ سعدی شیرازی نے مصر، حبش، افریقہ، دمشق، تبریز، کوفہ، خلیج فارس، بصرہ، بحر روم، سکندریہ، بیت المقدس، بحر عمان، بحر قلزم، اصفہان، بحر ہند، حجاز، واسط، طرابلس الشرق اور بحر عرب وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ ان ممالک کے سفر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعدی شیرازی کو سیر و سیاحت سے اس قدر دلچسپی اور شوق تھا کہ زندگی کا نصف حصہ سیر و سیاحت میں گزار دیا اور اس سے ان کے علم و فضل میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی اپنی تصنیف میں سعدی شیرازی کے متعلق متعدد پہلوؤں کو بحث طلب لائے اور انھی موضوعات میں سعدی شیرازی کی گلستان و بوستان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہراً فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوعِ خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھے سو برس سے برابر جاری ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مشرق اور مغرب کے اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ترجمے ہوئے۔[۲۸]

> اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب اخلاق، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے، بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ "احد ھما افضل من الآخر"[۲۹]

منشی احمد حسین خاں نے ۱۸۹۵ء میں سعدی شیرازی پر حالات سعدی کے نام سے سوانح عمری لکھی۔ اس کتاب کے کل آٹھ ابواب ہیں اس میں ان کی ولادت، علمی استعداد، سیر و سیاحت، مراجعت و وفات، شیخ کی شہرت، سعدی کی تصانیف پر رائے اور دیگر شعراء وغیرہ کے عنوان سے ابواب شامل ہیں۔ منشی احمد نے سعدیؒ کے زندگی کے واقعات انتہائی خوبصورت انداز سے تفصیل کے ساتھ قارئین کے سامنے لائے۔ انھوں نے اپنے اسلوب بیان میں پر تصنع اور دقیق الفاظ سے گریز کرتے ہوئے سادگی و سلاست اور مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی سے کام لیا ہے جو

ان کی تحریر کو پر لطف بنا دیتی ہے۔ منشی احمد حسین کے مطابق سعدیؒ کو تحریر و تقریر پر اس قدر گرفت حاصل تھی کہ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> شیخ میں ایک نرالی بات یہ تھی کہ صاحب قلم و زبان تھا۔ جس قدر اس کی تحریر میں زور تھا۔ اس سے دس گنا زیادہ اس کی تقریر میں شور تھا۔ اس عذاب البیانی اور طلیق اللسانی سے وہ بحث و مناظرہ کی مجلس میں اپنا رنگ جمالیتا تھا کہ اس کی رائے سب پر غالب رہتی تھی۔[۳۰]

مولانا شبلی نعمانی نے سن ۱۹۸۸ء میں شعر العجم (حصہ دوم) کے نام سے کتاب لکھی اور دیگر لوگوں پر مضامین لکھے ان میں سے ایک مضمون سعدیؒ پر لکھا ہے دوسرے مصنفین کی طرح شبلی نعمانی نے بھی سعدی شیرازی کی زندگی کے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ سعدیؒ کے والد ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے والد کے ساتھ مل کر زہد و عبادت کرتے تھے ان کے ساتھ مختلف محافل میں جاتے تب سے ہی شیخ سعدی کو علم و ادب کا شوق تھا۔ والد کی محبت و شفقت انھیں کم نصیب ہوئی کیوں کہ ان کے والد بچپن میں ہی رحلت فرما گئے مگر والد کی صحبت نے ان کی شخصیت کو متاثر کیا ہے۔ شبلی نعمانی، سعدی کے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور تربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ عید گاہ میں ان کو ساتھ لے کر چلے، ہاتھ میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہو جائے، راستے میں بچے کھیل رہے تھے، یہ دامن چھوڑا کر ان میں جا ملے اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا، کشمکش اور ہجوم میں آپ کی صورت نظر نہ آئی، تو گھبرا کر رونے لگے، اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا کان پکڑ کر کہا احمق! تجھ سے کہا نہ تھا دامن نہ چھوڑنا۔[۳۱]

اردو ادب میں ان تصانیف کے علاوہ منشی سکندر علی خاں صاحب شیروانی نے شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کے حالات زندگی پر حیات سعدی کے نام سے تصنیف لکھی۔ سید عبداللہ نے سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ میں مولانا الطاف حسین حالی کی تصنیف حیات سعدی پر ایک نظر ڈالی۔ علاوہ ازیں قیام الدین قائم نے بھی اپنی تصنیف تذکرہ مخز ن نکات میں سعدی کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ سعدی شیرازی فارسی کے صفِ اول کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے بدولت پند و نصائح کو عام کیا۔ گلستان و بوستان نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے اسی وجہ سے ان کی تصانیف کے تراجم تقریباً دنیا کی ہر زبان میں دستیاب ہیں۔

اردو ادب میں بھی بعض مصنفین نے سعدیؒ کی تصنیف گلستان و بوستان کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں نظر زیدی، طالب ہاشمی، قاضی سجاد حسین اور محمد ندیم محمدی شامل ہیں۔ نظر زیدی نے سعدی کی

حکایات کا اردو میں ترجمہ حکایات بوستان سعدی اور حکایات گلستان سعدی کے نام سے کیا اور کہا کہ " حضرت سعدی کی عبارتوں کا ترجمہ کسی کے بس کی بات نہیں انھوں نے اپنی نثر اور نظم میں جو ساحری کی ہے اور عبارتوں کو سجانے کے فن میں دکھایا ہے وہ انھی پر ختم ہو گیا۔"[۳۲] قاضی سجاد حسین نے بوستان سعدی کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال عطاری نے حکایات سعدی کے نام سے کتاب مرتب کی اور طالب ہاشمی نے بھی حکایات سعدی (دلچسپ و نصیحت آموز) کے نام سے کتاب مرتب کی۔ اور وہ سعدی کے ترجمے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ان دونوں عظیم کتابوں کی چیدہ چیدہ حکایات، ضرب الامثال اور اقوال کو عام فہم اردو کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ (ڈاکٹر غلام جیلانی برق) سعدیؒ جا ترجمہ آسان نہیں، اس کا مفہوم تو ادا ہو سکتا ہے لیکن اس کی فصاحت، سلاست، موسیقی، ترنم اور سجع بندی کو اردو میں منتقل کرنا محال ہے۔[۳۳]

اردو ادب میں سعدیؒ پر متفرق مقالات اور کتب کے علاوہ بہت سے مصنفین نے مضامین قلمبند کیے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر محمد شاہ کھگہ نے "سعدی شیرازی اور حکیمانہ اخلاق" کے عنوان سے روزنامہ ۹۲ نیوز، بروز پیر ۳۰ دسمبر ۲۰۱۹ء کو مضمون شائع کیا۔ اس مضمون میں محمد شاہ نے سعدی شیرازی کے حکیمانہ اخلاق پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ "آپ کی ذات والا صفات، زہد و تقوی، اخلاق و تصوف، عشق و مستی اور علمی و عملی خصوصیات کی حامل تھی۔"[۳۴] اور اس تحریر میں سعدیؒ کی اخلاقیات و روحانیت کی تعریف کرنے کے ساتھ ان کی چند نصیحت آموز حکایات بھی نقل کی ہیں۔ گلستان کے متعلق لکھا ہے:

> گلستان میں سیرت پادشاهان، سیرت درویشان، قناعت، خاموشی، عشق و جوانی، ضعف پیری، تاثیر تربیت اور آداب صحبت شامل ہیں۔ گلستان سعدی کی ہر بات قول صادق کی حیثیت رکھتی ہے۔[۳۵]

محمد شاہ کھگہ کے علاوہ روزنامہ ۹۲ نیوز میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے "سعدی شیرازی سے دعوت شیراز تک" کے عنوان سے بروز منگل ۱۷ مارچ ۲۰۲۰ء کو یہ مضمون لکھا ہے۔ سید صبغت اللہ سہروردی نے بھی روزنامہ ۹۲ نیوز میں بروز جمعرات ۱۷ دسمبر ۲۰۲۰ء کو "حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔ ممتحنہ اختر نے اردو ریسرچ جنرل جنوری تا مارچ ۲۰۱۶ء میں "حیات سعدی کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں حالی کی تحریر کردہ تصنیف حیات سعدی پر تنقید کرتے ہوئے رشید حسن خان اور سید

عبداللہ کی اقتباس کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے۔حیات سعدی کی خصوصیات گردانتے ہوئے سید عبداللہ کا قول نقل کرتے ہوئے ممتحنہ اختر لکھتی ہیں:

> حیات سعدی کی اہمیت کے لیے ہمارے پاس ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے اس کتاب میں ادبی اصلاح کے متعلق ایک نظریہ قائم کر لیا تھا اور بعض ایسے مضامین چھیڑے ہیں جن کو مقدمہ دیوان میں پختہ شکل میں پیش کیا ہے۔ غرض حیات سعدی میں وہ اصلاح کا جذبہ ابھی ابتدائی حالت میں نظر آتا ہے جو بعد میں ایک مستقل تحریک بن جاتا ہے۔[۳۶]

مزید بر آں اخبار اردو میں ڈاکٹر رضا مصطفوی نے جلد ۱۸، شمارہ ۲، ص ۳۸، جون ۲۰۰۲ء میں "پاکستان میں سعدی کا خوبصورت تذکرہ" کے عنوان سے مضمون لکھا۔ "سعدی شیرازی شہرت دوام بخشنے والے شاعر اور فلسفی کی اجمالی داستان" کے عنوان سے محمد عاصم بٹ نے روزنامہ دنیا میں مضمون تحریر کیا۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) غلام جیلانی خان نے "سعدی اور گوہر نایاب" کے نام سے مضمون لکھا اور زوبین بخرد نے ۱۶ اگست ۲۰۲۰ء کو بی بی سی اردو نیوز میں "۱۳ صدی کے فارسی شاعر سعدی سے ہم آج کیا سیکھ سکتے ہیں" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا۔ یہ تمام مضامین سعدی شیرازی کی شخصیت اور فن پر مختلف انداز سے قلمبند کیے گئے ہیں۔ شیخ سعدی شیرازی کو دنیائے ادب میں اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے۔

اردو ادب پر سعدیؒ نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں بہت سے ادباء نے ان کی شخصیت کے متفرق پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سعدی شیرازی کی گلستان و بوستان دونوں کتب اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی طرز پر بہت قلیل تعداد میں کتب لکھی گئی ہیں۔ ان میں عبدالرحمان جامی کی بہارستان، مجدالدین خوفی کی خارستان اور قاآنی شیرازی کی پریشان قابل ذکر ہیں۔ حالی نے اپنی تصنیف حیات سعدی میں کہا کہ ان تینوں تصانیف میں گلستان کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اردو ادب میں شیخ سعدی کو ابھارنے میں سب سے نمایاں کردار مولانا الطاف حسین حالی کا رہا ہے کیوں کہ انھوں نے حیات سعدی لکھ کر سعدی شیرازی کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ نثر کے علاوہ شاعری میں بھی شعراء کی کثیر تعداد سعدی شیرازی سے متاثر تھی ان میں مولانا الطاف حسین حالی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، مظفر علی خاں، اکبر الہ آبادی اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ سعدی شیرازی کی طرح، علامہ اقبال بھی سادگی کو پسند کرتے تھے۔ سعدی کی سادہ بیانی کی مثال ملاحظہ ہو:

خواہی کہ بہ طبیعت ہمہ کس دارد دوست
باہر کہ در اوفتی چناں باش کہ اوست[۳۷]

اسی طرح علامہ اقبال کی طبعیت اور مزاج میں بھی سادہ بیانی پائی جاتی ہے۔ ضرب کلیم کی نظم "مرد بزرگ" سے مثال ملاحظہ ہو:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد ہ، معانی میں دقیق[۳۸]

اردو ادب پر سعدیؒ نے اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں بہت سے ادباء اور مصنفین نے ان کی شخصیت و فن پر دیگر کتب، مضامین اور مقالات قلمبند کیے۔ اردو ادب میں سعدیؒ اپنے سادہ انداز تکلم کی بدولت مشہور ہوئے ہیں۔ اس باب میں سعدیؒ کی شخصیت پر تحریر کردہ مختلف مضامین، اور مقالات جو اخبار، کتب اور رسائل میں شائع ہوئے ان کا سرسری جائزہ لیا گیا۔ سعدیؒ کی شخصیت اور فن پر موجود کام کا اوپر مختصراً تذکرہ اور ادب پر ان کے اثرات کا اجمالی جائزہ لیا گیا۔ سعدیؒ کی حکایات ہر نوع انسانی کی زندگی کے لیے اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کی حکایات ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہدایت و نور کا سرچشمہ رہی ہیں۔ ان کا انداز بیان اور فکر و نظر درویشانہ ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں فصاحت و بلاغت اور سادگی و سلاست کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ نظیرؔ کی شاعری پر ان کے اثرات اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ان کی حکایات میں پند و نصیحت اور روحانی پہلو پوشیدہ ہیں۔ سعدیؒ بہت ہی سادہ انسان تھے۔ انھیں دنیاوی مال و زر سے لگاؤ نہ تھا بلکہ اپنا سارا وقت یاد الٰہی میں گزارتے تھے۔ جبکہ آگے چل کر نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدی شیرازی کے فکری اثرات کا مطالعہ کیا گیا۔ المختصر سعدیؒ کی حکایات ہر انسان کی شخصیت سازی میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ جبکہ ان کی معرکتہ لآراء تصانیف گلستان و بوستان کی روشنی میں "نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدیؒ کے فکری اثرات" کو دیکھا جائے گا۔ سعدی کے ان سماجی و اخلاقی پہلوؤں پر ہم عمل درآمد کر کے ایک بہترین معاشرے کی تشکیل نو کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اردو لغت تاریخی اصول پر

#شاعری=http//: udb.gov.pk/result.php?search

تاریخ ملاحظہ ۳مارچ ۲۰۲۱

۲۔ کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر اک نظر (پٹنہ: دی قومی پریس لمیٹڈ، س۔ن۔)، ص ۵۔

۳۔ پرویز احمد اعظمی، اردو میں سیاسی شاعری کی ادبی قدر و قیمت ۱۹۰۰ء۔۱۹۵۰ء (دہلی: نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹر، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۲۔

۴۔ سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۸۰۔۲۸۱۔

۵۔ شیخ سعدی شیرازی، گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی (لکھنؤ: مطبع کمار واقع، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۳۔

۶۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء)، ص ۳۷۹۔

۷۔ شیخ سعدی شیرازی، گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی، ص ۱۲۱۔

۸۔ حامدی کاشمیری، انتخاب کلام (دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۲ء)، ص ۴۶۷۔

۹۔ وحید اختر، خواجہ میر درد تصوف اور شاعری (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۱ء)، ص ۳۲۴۔

۱۰۔ شیخ سعدی شیرازی، گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی، ص ۲۷۔

۱۱۔ عبدالباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی (لکھنو: نول کشور پریس، ۱۹۵۱ء)، ص ۶۱۶۔

۱۲۔ شیر محمد بزدار، اقبال اور سعدی کا فلسفہ اخلاق تحقیقی جائزہ، (ایم فل اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء)، ص ۶۱۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۱۴۔ نذیر احمد، "سعدی شیرازی کی ولادت کے سلسلے کی چند داخلی شہادتوں کا جائزہ" مشمولہ معارف ،ج۱۳۱(جون ۱۹۸۳ء)، ص ۴۳۳۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۴۱۔

۱۶۔ نذیر احمد، "کچھ سعدی شیرازی کے بارے میں" مشمولہ معارف ،ج۱۴۳(مئی ۱۹۸۹ء)، ص ۴۳۰۔

۱۷۔ سید سلیمان ندوی، "سعدی کا سرائے اغلمش" مشمولہ معارف، ج۳۱(فروری ۱۹۳۳ء)، ص ۱۲۹۔

۱۸۔ شیخ سعدی، گلستان (لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۸۸۰ء)، ص ۴۹۔

۱۹۔ منیر احمد خاں، "کلام سعدی میں احادیث کی تلمیحات" مشمولہ معارف، ج۱۷۲(جولائی ۲۰۰۳ء): ص ۴۳۔

۲۰۔ قاضی سجاد حسین، بوستان سعدی (دہلی: سب رنگ گھر، ۱۹۵۵ء)، ص ۳۔

۲۱۔ منیر احمد خاں، "کلام سعدی میں احادیث کی تلمیحات"، ص ۴۹۔

۲۲۔ مصلح الدین سعدی، کریما (لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۸۸۴ء)، ص ۳۔

۲۳۔ منیر احمد خاں، "کلام سعدی میں احادیث کی تلمیحات"، ص ۵۴۔

۲۴۔ شیخ فرید، "سعدی دکنی کا وطن اور ان کے بعض نئے اشعار" مشمولہ معارف، ج۱۰(اگست ۱۹۵۷ء)، ص ۱۴۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۶۔

۲۶۔ رام لعل نابھوی، "کیا سعدی ہندوستان آئے تھے" مشمولہ معارف، ج۱۴۹(جنوری ۱۹۹۲ء)، ص ۴۹۔ ۵۰۔

۲۷۔ الطاف حسین حالی، حیات سعدی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۱ء)، ص ۳۷۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۳۰۔ منشی احمد حسین، حالات سعدی (لاہور: خادم التعلیم پریس، ۱۸۹۵ء)، ص ۷۰۔

۳۱۔ شبلی نعمانی،شعر العجم حصہ دوم(اعظم گڑھ: مطبع معارف،۱۹۸۸ء)،ص۲۷۔

۳۲۔ نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی(لاہور:فیروز سنز،س۔ن۔)،ص۱۱۔

۳۳۔ محمد شاہ کھگہ،"سعدی شیرازی اور حکیمانہ اخلاق"مشمولہ روزنامہ ۹۲ نیوز،۳۰دسمبر۲۰۱۹۔

سعدی۔شیرازی۔اور۔حکیمانہ۔اخلاق/https://www.roznama92news.com

۳۴۔ شیخ سعدی،حکایات سعدی دلچسپ و نصیحت آموز مرتبہ طالب ہاشمی(دہلی:دارالاشاعت مصطفائی،۲۰۱۰ء)،ص۱۶۔۱۷۔

۳۵۔ محمد شاہ کھگہ،"سعدی شیرازی اور حکیمانہ اخلاق"مشمولہ روزنامہ ۹۲ نیوز،۳۰دسمبر۲۰۱۹۔

سعدی۔شیرازی۔اور۔حکیمانہ۔اخلاق/https://www.roznama92news.com

۳۶۔ ممتحنہ اختر،"حیات سعدی کا تنقیدی جائزہ"مشمولہ اردو ریسرچ جنرل(جنوری۲۰۱۶)

http://www.urdulinks.com/urj/?p=768

۳۷۔ شیر محمد بزدار،اقبال اور سعدی کا فلسفہ اخلاق تحقیقی جائزہ،ص۱۱۶۔

۳۸۔ علامہ اقبال،کلیات اقبال اردو،ص۶۴۱۔

حواشی:

امیر خسرو: ریختہ پر موجود مضمون میں امیر خسرو سے پہلے ہندی شاعری کا کوئی نمونہ نہیں ملتا ہے۔

رام بابو سکسینہ نے نے اپنی تصنیف اردو ادب کی تحریکیں میں امیر خسرو کو نہ صرف اردو کا شاعر اور ادیب کہا بلکہ اردو کا پہلا شاعر بھی کہا۔ ص ۳۸۔

محمد جمیل ایم۔اے نے اردو شاعری کی مختصر تاریخ میں امیر خسرو کا اردو کا پہلا شاعر کہا ہے۔

شیخ سعدیؒ کی تاریخ پیدائش: حالی لکھتے ہیں کہ سعدی کا سال ولادت کسی نے نہیں لکھا- سال وفات لکھا ہے یعنی سنہ ۶۹۱ھ اور عمر کم سے کم ۱۲۰، ۱۱۰ برس کے مطابق ان کی عمر ۵۸۹ھ قرار پاتی ہے۔ ان کے استاد ابو الفرج جوی کی وفات ۵۸۹ھ میں ہوئی اس وقت سعدیؒ کی عمر ۹ برس ہو گی۔ اس لیے ان کی عمر ۱۰۳ سال سے کم نہیں گردانی چاہیے۔

باب دوم:

نظیر اکبر آبادی کی منظومات پر شیخ سعدی کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات

نظیر اکبر آبادی کی سن پیدائش ۱۱۴۷ھ بمطابق ۱۷۳۵ء☆ بتائی جاتی ہے۔ آپ کا اصل نام ولی محمد اور تخلص نظیرؔ تھا۔ نظیرؔ نے اپنی محنت و لگن اور عمیق مشاہدے سے اردو شاعری میں ایک منفرد مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری آج بھی عام و خواص میں مشہور ہے۔ نظیرؔ چوں کہ آزاد منش انسان تھے اس لیے انھوں نے اس عہد میں شاعری کے مروجہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنی شاعری کے لیے ایک نئی سمت اختیار کی جو عوام الناس کے دل کے قریب تھی بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ نظیر اکبر آبادی لوگوں کا دکھ درد سمجھنے والے انسان تھے اس لیے ان کی شاعری کے موضوعات میں عوام کے مسائل کا بیان موجود ہے۔ آپ کی نظموں اور غزلوں میں بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں سماجی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی تہوار وغیرہ کو موضوع بحث لایا گیا ہے۔ نظیرؔ کی ذاتی زندگی کے متعلق مختلف مصنفین نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نظیر کے اخلاق کے بارے میں اپنی تصنیف دیوان نظیر اکبر آبادی میں بیان کرتے ہیں کہ:

> نظیر کے عادات و اخلاق کی سب نے تعریف کی ہے۔ وہ ایک آزاد شخص تھے۔ اس لیے دنیا سے بے نیاز تھے۔ تمام عمر نہ کسی کی مدح کی نہ ہجو، جس سے ملتے اخلاق سے ملتے مزاج میں حلم تھا۔ اگر کوئی بات خلاف بھی ہوتی تو پیشانی پر بل نہ آتا، اپنی خوش مزاقی سے ہر انجمن کو شگفتہ کر دیتے تھے۔[۲]

نظیر اکبر آبادی کا اخلاق نہایت شائستہ، نرم اور خوش مزاج تھا۔ آپ کے اخلاق کا اندازہ ان کی شاعری سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں دنیا سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی کی مدح سرائی کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں سادگی کا پہلو نمایاں ہیں۔ نظیرؔ ایک شریف النفس انسان تھے۔ ان کا لباس بھی انھی کی طرح سادہ تھا۔ گندمی رنگ، چمکدار آنکھیں، داڑھی اور مونچھیں رکھنا اس عہد میں رعب دار شخصیت کی نشانی تھی۔ علاوہ ازیں پگڑی، پاجامہ، کرتہ، کھتیلی جوتا، چھڑی اور انگلیوں میں انگوٹھیاں وغیرہ پہننا بھی ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی تصنیف دیوان نظیر اکبر آبادی میں نظیرؔ کا حلیہ کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> نظیر کا رنگ گندم گوں، قد میانہ، پیشانی اونچی اور چوڑی۔ آنکھیں چمکدار، اور بینی بلند تھی، داڑھی خشخاشی اور مونچھیں بڑی رکھتے تھے۔۔۔ دہلی میں رائج تھا یعنی کھڑکی دار پگڑی لباس وہی تھا

جو محمد شاہ کے زمانہ میں، گاڑے کا انگرکھا سیدھا پردہ نیچی چولی اس کے نیچے کرتہ ایک برکا پاجامہ، گھیتلی جوتی، ہاتھ میں شام دار چھڑی، انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔[۳]

نظیرؔ کے حالات زندگی پر مزید روشنی ڈالی جائے تو انھوں نے نہایت ہی سادہ زندگی بسر کی تھی، آپ کو مال و دولت اور امرا و شرفاء سے لگاؤ نہیں تھا۔ پیشے کے لحاظ سے معلم تھے۔ امراء کی مدح سرائی کو انھوں نے اپنا پیشہ نہیں بنایا بلکہ محنت و مشقت سے حلال کی روزی کمائی۔ آپ کو دربار سے بلاوے بھی آتے مگر نظیر اکبر آبادی ان سے معذرت کر لیتے تھے۔ پروفیسر شہباز اپنی تصنیف زندگانی بے نظیر میں نظیر اکبر آبادی کی سخاوت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

ان کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ نانا جان بڑے ہی سخی مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے تمام عمر اپنے ہاتھ سے روپیہ نہیں چھوا۔ جہاں کہیں سے روپیہ آیا۔ روپیہ لانے والے سے کہا اس کو رومال میں باندھ دو۔ پھر اس رومال کا ایک سرا پکڑ کر جیسے کوئی نجس چیز ہو گھر میں ڈال جاتے یا کسی آدمی سے کہتے گھر بھجوا دو نانی کا جس طرح جی چاہتا خرچ کرتیں۔ وہ پوچھتے بھی نہیں کیا ہوا۔ اور کدھر گیا۔[۴]

نظیرؔ نے اپنی تمام عمر سادگی میں گزاری۔ اور انھوں نے سن ۱۲۴۶ھ بمطابق ۱۸۳۰ء[۵] میں وفات پائی۔ یوں نظیر اکبر آبادی کی شخصیت کا مختصر تعارف بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ ہمارا اصل مقصد "نظیرؔ کی شاعری پر سعدیؒ کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ" ہے۔ مگر اس سے قبل تحقیق کے میدان میں ان پر مختلف حوالوں سے کافی کام ہو چکا ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔ نظیرؔ پر نہ صرف ہندی زبان بلکہ انگریزی اور اردو زبان میں بھی کافی کام ہو چکا ہے اور اس حوالے سے کئی مقالات و مضامین منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اردو ادب میں ان کی شخصیت اور کلام پر وقتاً فوقتاً تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

اردو ادب میں نظیرؔ کی شخصیت اور فن پر مختلف حوالوں سے تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ نہ صرف تحقیقی سطح پر بلکہ رسائل و جرائد میں بھی ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر مقالات و مضامین تحریر ہو چکے ہیں۔ سید طلعت حسین نقوی نے عتیق احمد صدیقی کے زیر نگرانی "نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ سن ۱۹۹۰ء میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اس مقالے کے کل سات ابواب اور ان کے ذیلی عنوان بھی ہیں۔ اس مقالے کا بنیادی مقصد نظیرؔ کے کلام کا تنقیدی مطالعہ پیش کرنا تھا۔ اس مقصد کو بیان کرنے کے لیے مقالہ نگار نے نظیر کے حالات زندگی، مذہبی و سیاسی حالات، نظیر کی غزلیہ شاعری اور ان کی شاعری میں ڈرامائی عناصر، نظم اور زبان

و بیان پر کھل کر تنقیدی بحث کی ہے۔ طلعت حسین نقوی، نظیرؔ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی پیدائش ،مشاغل،ذریعہ معاش،شاعری،شادی اولاد، جوانی،پیری،حلیہ،اخلاق و عادات،غذا،ظرافت،تصانیف ، نظم و نثر،اور وفات وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے نظیرؔ کے بڑھاپے کی عمر کی مرغوب غذا کے متعلق پروفیسر شہباز کی ایک دلچسپ بات نقل کی ہے کہ:

> کھانے کو تو جوانی میں سب چیز کھاتے ہوں گے، مگر بڑھاپے میں چانول اور کھچڑی نہایت شوق سے کھاتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے۔ گھی آدھ سیر روز کھاتے تھے۔ اچاروں میں لیموں کا اچار بہت پسند تھا۔ تیل کا اچار کبھی نہیں کھاتے ۔ گلگلے اور چلّے بھی پسند کرتے تھے۔ پھلوں میں خربوزہ، آم، شریفہ یہ چند پھل بہت مطبوع تھے۔[۶]

شریف احمد قریشی نے معین احسن جذبی کے زیر نگرانی مارچ ۱۹۸۹ء میں "فرہنگ روح نظیر" کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ تحریر کیا اس مقالے کا مقصد نظیر کے کلام کی فرہنگ تیار کرنا تھا تا کہ ان کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہو اور ان الفاظ کے اصل معنی معلوم کرنا تھے۔ جو ان کی شاعری میں استعمال کیے گئے۔اس مقالے میں انداز ترتیب،روح نظیر کے متعلق، مخففات اور کلام نظیر کے بعض ادبی اور معلوماتی الفاظ منظر عام پر لائے مزید یہ کہ شریف احمد قریشی نے فرہنگ الف بائی ترتیب سے بنائی۔ نظیر کے کلام الفاظ کے متعلق لکھتے ہیں:

> نظیر اکبر آبادی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کلام الفاظ کا لاتعداد خزینہ ہے،جو مخصوص زندگی، مخصوص عہد اور مخصوص سماج کا آئینہ دار ہے اس کا کلام جابجا محاورات،اصطلاحات، عام بول چال اور روزمرہ سے مملو ہے۔ نظیر فارسی، عربی مرکبات، اردو، فارسی،ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اور ان کی تراکیب کے علاوہ پنجابی، مارواڑی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کرتا ہے۔یہی نہیں برج بھاشا اور مقامی بولیوں کے الفاظ جس قدر نظیرؔ نے اپنے کلام میں کھپائے ہیں۔ دوسرے شاعروں کے ہاں شاذ ہی ملیں گے۔[۷]

نظیرؔ عوامی شاعر تھے۔اس لیے ان کی شاعری میں سماجی، اخلاقی اور روزمرہ کے حالات کا بیان خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ محمد افضل حمید اور ذوالفقار علی نے "نظیر اکبر آبادی اور فلسفہ زر" کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔نہ صرف یہ بلکہ رسالہ "نگار" اور "زمانہ" کے مختلف سنین میں بھی نظیر اکبر آبادی کی زندگی کے چند ایک پہلوؤں پر مقالات و مضامین لکھے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

مسٹر سلیم جعفر نے رسالہ "زمانہ" شمارہ ۲، جلد ۸۴، فروری ۱۹۴۵ء میں "نظیر اکبر آبادی یا دہلوی؟ کے عنوان سے مضمون تحریر کیا۔ اس مضمون میں سلیم جعفر نے نظیر کے وطن اکبر آبادی یا دہلوی پر بحث کی اور مختلف نظریوں کے تحت اس نتیجے پر پہنچے کہ نظیر دہلوی تھے اور پھر کہا کہ اگر کوئی ان کو اکبر آبادی ثابت کرنا چاہتا ہے تو وہ دلائل سے اپنی بات کر سکتا ہے۔ اسی رسالے میں سلیم جعفر کے چند ایک اور مضامین شامل ہیں۔ "نظیر بے نظیر"، نظیر اکبر آبادی اور تغزل"، نظیر اکبر آبادی کی مصوری" اور "نظیر اکبر آبادی اور ہندی کا عروض" وغیرہ شامل ہیں۔ رسالہ زمانہ میں سلیم جعفر کے علاوہ ع۔ ایم۔ اے کا مضمون "نظیر کی بے اعتدالیاں" عبدالرحمن سیتاپوری کا مضمون "نظیر اکبر آبادی ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے" وغیرہ شامل ہیں۔

انتظام اللہ شہابی نے رسالہ نگار لکھنو میں جنوری ۱۹۴۰ء میں "نظیر کی مختصر سوانح" کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انتظام اللہ نے نظیر کی پیدائش، عہد جوانی، ملازمت، مذہب، علمی لیاقت، شاعری، صوفیانہ وضع، اخلاق و عادات، حلیہ، تصانیف و تالیف، خانگی زندگی، خادم، مرغوب غذا، آخری ایام، علالت، اولاد اور وفات وغیرہ پر مختصراً بات کرتے ہوئے ان کی سوانح کا خوب صورتی سے بیان کیا۔

نیاز فتح پوری نے رسالہ نگار میں سن ۱۹۴۰ء میں "نظیر میری نظر میں" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا۔ اس مضمون میں نیاز فتح پوری نے نظیر کو "چٹکلے باز" شاعر کہا اور تفصیل سے اس کا مفہوم بھی بتایا اور کہا کہ:

> "چٹکلے باز" ہماری سوسائٹی کا وہ انسان ہے (سوسائٹی سے علاحدہ اس کا کوئی مفہوم متعین نہیں کیا جاسکتا) جو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک، ہر عمر و طبقے کی محفل میں اپنی جگہ پیدا کرلیتا ہے جو کبھی "بار خاطر" نہیں، بلکہ ہمیشہ "یار شاطر" ثابت ہوتا ہے اور جس کی ہستی تکلف و تصنّع سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کارجائی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے اور خود وہ ہنسے یا نہ ہنسے لیکن دوسروں کو کی کوشش ضرور کرتا ہے۔[۸]

نظیر اکبر آبادی نے ذخیرہ الفاظ، جزئیات نگاری، مناظر پرستی، محاسن شعری کو جس طرح سے برتا ہے وہ ان کی انفرادیت کا کمال ہے۔ نیاز فتح پوری کے مطابق ان کو عوامی شاعر تک محدود کرنا سراسر غلطی ہے ان کے نزدیک وہ عوام و خواص، امیر و غریب ہر طبقے کے لوگوں کے شاعر تھے۔ ان خصوصیات کو گردانتے ہوئے نظیر کو منفرد شاعر کہا۔ رسالہ نگار میں نہ صرف نیاز فتح پوری نے نظیر کے متعلق مضمون تحریر کیا بلکہ مجنوں گورکھ پوری نے بھی رسالہ نگار میں سن ۱۹۴۰ء میں "نظیر اکبر آبادی اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز" کے عنوان کے تحت مضمو ن لکھا۔ نظیر کو اردو شاعری میں بلند مقام حاصل نہ ہونے کی وجہ اہل نظر ہیں۔ جنہوں نے نظیر اکبر آبادی کو ابھی تک

مانا ہی نہیں ہے۔ مجنوں گورکھ پوری نے نظیر اکبر آبادی کے متعلق اہل نقد و نظر کی رائے دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

> اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی کی حیثیت متعیّن کرنا آسان کام نہیں ہے، اس لیے کہ اب تک اہل نقد و نظر نے ان کی کوئی قابل لحاظ حیثیت تسلیم نہیں کی۔ نظیرؔ کو پڑھتے سب تھے۔ 'الٰہی نامہ'، 'برسات کی بہاریں'، 'بنجارہ نامہ'، 'ہنس نامہ'، 'تندرستی نامہ'، 'ریچھ کا بچہ' کے اشعار اکثروں کے زبان پر چڑھے رہے ہیں لیکن جب ان کو کوئی مرتبہ دینے کا موقع آتا ہے تو سب اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں یا زیر لب کچھ کہہ کے رہ جاتے ہیں جیسے نظیرؔ کا نام لینا آداب مجلس کے خلاف ہو۔ یہ تو سب محسوس کرتے رہے ہیں کہ اردو شاعری میں نظیر ایک نئی قوت اور نیا امکان ہیں، مگر کوئی اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا۔[۹]

مجنوں گورکھ پوری نے اپنے اس طویل مضمون میں نظیرؔ کی شاعری میں موجود واقعیت اور جمہوریت کے عناصر پر بات چیت کی۔ مضمون نویس نے نظیر کا مختلف شعراء سے موازنہ کرتے ہوئے نظم و غزل سے مثالیں بھی پیش کیں اور یہ کہا کہ نظیرؔ اردو شاعری میں نئے رجحان کو سامنے لائے۔

رسالہ نگار میں نظیر اکبر آبادی پر ان مضامین کے علاوہ دیگر مضامین بھی شامل ہیں۔ ان میں مخمور اکبر آبادی کا مضمون "نظیر پر ایک نظر"، سید احتشام حسین کا "نظیر اکبر آبادی اور عوام"، عبد الباری آسی کا "نظیر کی جزئیات نگاری اور زباں دانی ادبیات اردو میں نظیر اکبر آبادی"، سید اختر علی تاہری کا مضمون "نگار کا نظیر نمبر اور موجودہ طرز تنقید" اور اختر اورینوی کا "نظیر اکبر آبادی پر ایک عمومی تبصرہ" وغیرہ شامل ہیں۔ رسائل کے علاوہ اردو ادب کی تاریخی کتب میں بھی نظیرؔ پر مضامین لکھے گئے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

انور سدید نے اپنی تصنیف اردو ادب کی مختصر تاریخ میں "نظیر اکبر آبادی" کے عنوان سے ساتواں باب مختص کیا ہے۔ اس باب میں نظیر کے متعلق دیگر ناقدین کی آراء کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ نظیرؔ نے منقبت، شہر آشوب، مثنوی، غزل، قطعہ اور رباعی جیسی اصناف میں شاعری کی مگر شہرت و مقبولیت طویل نظم کی بدولت ہوئی۔ انور سدید نے نظیر کی شاعری کی تعریف کے ساتھ ان کی خامی کا بھی ذکر کیا کہ وہ زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کا مقصد نظیرؔ کے پوشیدہ پہلوؤں کو سامنے لانا تھا۔

محمد جمیل احمد نے اپنی تصنیف اردو شاعری کی مختصر تاریخ میں "نظیر اکبر آبادی" کے عنوان سے مضمون لکھا اس مضمون کے ابتداء میں رام بابو سکسینہ کی کہی ہوئی بات کہ "نظیر ہندوستان کے شیکسپیئر ہیں" سے انحراف کیا۔ جمیل احمد کے مطابق نظیر میں وہ تمام خصوصیات موجود نہیں ہیں جو شیکسپیئر کے ہاں موجود

تھیں ۔علاوہ ازیں نظیرؔ کی خصوصیات بتائیں کہ ان کا اندزا عامیانہ ہے،فارسی کی آمیزش کم ہے، ہندی الفاظ کا استعمال، فطری اور نیچرل شاعری کی ہے۔

رام بابو سکسینہ نے اپنی تصنیف تاریخ ادب اردو میں "نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی" کے عنوان سے گیارھواں باب مختص کیا ۔ اس باب میں نظیر اکبر آبادی کا تعارف،واعظ یا ناصح،بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر، نظیر کی زبان، جدید رنگ کے پیشرو، ظریفانہ رنگ، مصور، اردو کا شیکسپیئر کون؟ جیسے موضوعات پر بات کی اور نظیر اکبر آبادی کے بارے میں کہا کہ: "نظیر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلی مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی۔"[۱۰] یعنی رام بابو سکسینہ نے نظیرؔ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان کے موضوعات میں ایسی شگفتگی اور شائستگی پائی جاتی ہے جو کسی دوسرے شاعر کے ہاں موجود نہیں ہے۔

ان تاریخی کتب کے علاوہ سید وقار عظیم نے سن ۱۹۷۱ء میں تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے نام سے کتاب لکھی ۔اس کتاب میں محمد صادق نے " نظیر اکبر آبادی " کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔سید احتشام حسین نے سن ۱۹۸۳ء میں اردو ادب کی تنقیدی تاریخ کے نام سے تصنیف لکھی اور اس کتاب کا چھٹا باب " نظیر اکبر آبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا" کے لیے مختص کیا۔ جمیل جالبی نے اپنی تصنیف تاریخ ادب اردو(جلد سوم) کا دوسرا باب "نظیر اکبر آبادی" کے حوالے سے لکھا۔ تبسم کاشمیری نے اپنی تصنیف اردو ادب کی تاریخ میں باب ۱۵ "عوامی روایت کا شاعر نظیر اکبر آبادی" کے متعلق تحریر کیا ہے۔

اردو ادب میں نظیرؔ کی شخصیت پر تاریخی کتب اور رسائل میں موجود مضامین کے علاوہ ان کی شخصیت اور کلام کے حوالے سے کتب بھی تحریر کی گئی ان کی تفصیل یہ ہے۔ محمد حسن مترجم یامین پرویز نے سن ۱۹۸۶ء میں نظیر اکبر آبادی کے عنوان سے مختصر مقالہ تحریر کیا۔ علی احمد فاطمی نے سن ۱۹۸۳ء میں نظیر اکبر آبادی کے نام سے کتاب لکھی۔ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نے سن ۱۹۷۹ء میں نظیر نامہ کے نام سے تصنیف لکھی۔ علاوہ ازیں سن ۱۹۷۸ء میں روح نظیر کے نام سے تصنیف لکھی۔ سید اختر اورینوی نے سن ۱۹۶۱ء میں مطالعہ نظیر کے عنوان سے کتاب تحریر کی۔ ابو اللیث صدیقی نے سن ۱۹۰۷ء میں نظیر اکبر آبادی ان کا عہد اور شاعری کے عنوان سے کتاب تحریر کی۔ طاہرہ پروین نے سن ۲۰۰۷ء میں نظیر اکبر آبادی بحیثیت عوامی شاعر کے عنوان سے کتاب لکھی۔ ان کتب کے علاوہ نظیر اکبر آبادی کے حوالے سے کچھ کتب مرتب بھی کی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

شمس الحق عثمانی نے سن ۱۹۷۹ء میں نظیر نامہ مرتب کیا۔ علاوہ ازیں ان کی ایک اور کتاب سن ۲۰۱۶ء میں دو جلدوں پر مشتمل نظیر فہمی مرتب کی۔ امیر حسن نورانی نے سن ۱۹۵۷ء میں نظیر اکبر ابادی حالات زندگی اور انتخاب کلام" کے عنوان سے تصنیف مرتب کی۔ شمس الدین احمد منیری نے سن ۱۹۴۰ء میں اشعار نظیر مرتب کی۔ عبدالغفور شہباز نے سن ۱۹۸۱ء میں زندگانی بے نظیر کے نام سے سوانح عمری لکھی اور سید محمد حسنین نے مرتب کی۔ مسعود حسین خاں نے سن ۱۹۸۸ء میں انتخاب نظیر اکبر آبادی" کے عنوان سے تصنیف مرتب کی۔ صدیق الرحمن قدوائی نے سن ۲۰۱۰ء میں نظیر اکبر آبادی ایک منفر دشاعر کے عنوان سے کتاب مرتب کی۔ ابن کنول نے سن ۲۰۱۳ء میں نظیر اکبر آبادی (منتخب شاعری) کے عنوان سے کتاب مرتب کی۔

نظیرؔ کی شخصیت اور کلام پر جہاں مختلف رسائل و جرائد میں مضامین و مقالے لکھے گئے۔ وہاں ان کے مزید مضامین اخبارات میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں عبدالعزیز ظفر نے ۲۴ مئی ۲۰۱۸ء کو "نظیر اکبر آبادی، بے مثال عوامی شاعر" کے عنوان سے روزنامہ دنیا میں اپنا مضمون شائع کیا۔ روزنامہ جنگ سنڈے میگزین میں ۲۴ جون ۲۰۱۸ء کو "نظیر اور عوامی شاعر" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔

اوپر بیان کردہ صفحات میں نظیر اکبر آبادی کی شخصیت اور فن پر مختصراً بات کی گئی ہے۔ مگر زیر نظر باب میں "نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات" کو موضوع بحث لایا جائے گا۔

نظیرؔ کی شخصیت اور فن کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اب ہم ان کی منظومات میں موجود مذہبی، سماجی و اخلاقی رنگ کا جائزہ لیں گے۔ یوں دیکھا جائے تو ہمیں نظیر کی شاعری میں مذہبی، سماجی و اخلاقی رنگ کافی حد تک نظر آتا ہے۔ اگلے صفحات میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدی شیرازی کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

سعدیؒ فارسی زبان و ادب کے بلند پایہ شاعر تھے۔ باوجود اس کہ انھیں اردو زبان و ادب میں شہرت و مقبولیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی قدر و منزلت میں کسی طور کمی نہیں آئی ہے۔ ان کی شاعری نے نہ صرف اردو ادب کو متاثر کیا ہے، بلکہ انگریزی زبان و ادب اور دیگر دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ سعدیؒ کے کلام کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری نے اردو شعراء کو بھی متاثر کیا ہے۔ سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی رنگ نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو متاثر کیا ہے۔ ان کی منظومات میں مذہبی، سماجی و اخلاقی رنگ جابجا نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں خدا کی دی ہوئی نعمتیں، رہے نام اللہ کا، تسلیم و رضا، تلقین توحید، چڑیوں کی تسبیح، ہو اللہ الخالق

الباری الخ، بنجارانامہ، تن کا چھونپڑا، زر کی فلاسفی وغیرہ جیسی منظومات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ المختصر اس باب میں ہم نظیر اکبر آبادی کی مذہبی، سماجی واخلاقی شاعری پر سعدیؒ کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

سعدیؒ کی حکایت "بندہ اور اس کا رب"[11] میں کہا کہ انسان روزی حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے اور دن، رات اسی میں مشغول رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ روزی حاصل کر سکے۔ اگر وہ اتنا ہی سرگرم روزی رساں کے لیے ہو جائے تو وہ نہ صرف سب کچھ حاصل کر لے گا بلکہ اس کا رتبہ بھی بلند ہو جائے گا۔ اس حکایت میں انسان کو اصل حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انسان جتنی کوشش مال ومتاع حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اگر اتنی ہی محنت روزی رساں یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے کرے تو انتہائی معتبر ہو جائے اس لیے انسان کو اپنی زندگی کا اصل مقصد یاد رکھتے ہوئے ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزار دینی چاہیے۔ ایسے میں دیکھا جائے تو یہی رنگ نظیر اکبر آبادی کی نظم "تلقین توحید" میں بھی نظر آتا ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں میں فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں ہر رنگ میں پہچان
ہرراہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہرعزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان[12]

اس نظم کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ نظیرؔ نے اللہ تعالیٰ کو ماننے اور اس کی بندگی کرنے کا کہا کہ تم اس ذات کو اپنے دل میں ہر باغ، ہر دشت، بے رنگ، با رنگ، نیرنگ، منزل مقامات، نت روم، ہر آہنگ، ہر دھوم، ہر صلح اور ہر جنگ میں پہچانو۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے عاشق بننا چاہتے ہو تو اس ذات کو ہر رنگ، ہر روپ، ہر آن میں ڈھونڈو۔ یہ دنیا عارضی ہے فنا ہو جائے گی۔ کسی نے باقی نہیں رہنا ہے۔ ہر ایک کی موت کا وقت مقرر ہے۔ اس لیے انسان دنیاوی زندگی کی چاہ کے بجائے اصل حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچانے۔ اس کو تلاش کرنے کی جستجو کرے۔ اس نظم میں بھی اللہ تعالیٰ کو ماننے اور پہچاننے کی تلقین کی گئی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی کی نظم

TH25037

"تلقین توحید" پر سعدیؒ کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ شیخ سعدی شیرازی کی حکایت "بندہ اور اس کا رب" میں انسان کو دنیاوی ضروریات سے گریز کرتے ہوئے اصل مقصد اور حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور "تلقین توحید" میں بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کو پہچاننے کا حکم دیا گیا ہے۔ حالاں کہ حکایت اور نظم کا انداز بیان مختلف ہے۔ باوجود اس کے دونوں کا مقصد عشق الٰہی کو جاننا اور پہچاننا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی ایک اور نظم "تسلیم ورضا" پر بھی یہی اثرات نظر آتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ہر دام میں ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں[۱۳]

ان اشعار میں نظیرؔ نے یہی بیان کیا ہے کہ انسان کو ہر حالت میں خوش رہنا چاہیے یعنی انسان فقر کو اپنالے تو وہ تنگدستی میں اور ہر حال میں مطمئن اور خوش رہے گا۔ فقر سے مراد وہ خود کو اصل کی طرف راغب کرلے، قناعت و ریاضت کی زندگی اختیار کرلے، توکل اور درویشی کو اپنا منبع بنالے۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم "تسلیم ورضا" میں کہا کہ انسان اگر فقر کو اپنالے تو اللہ تعالیٰ اسے امیری وغریبی، مال ودولت، مقام ومرتبہ، مفلسی ولاچاری جس حال میں بھی رکھے وہ خوش وخرم رہے گا۔ یوں اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچان لینے سے انسان کی زندگی خوبصورت ہو جائے گی۔ جس طرح شیخ سعدی کی حکایت "بندہ اور اس کا رب" میں اصل حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کو جاننے کا کہا گیا ہے۔ ایسے میں نظیرؔ کی نظم "تسلیم ورضا" میں مختلف انداز میں اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہنے کا درس دیا گیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو سعدیؒ کی حکایت میں اللہ تعالیٰ کو جاننے اور پہچاننے کا حکم دیا جبکہ نظم میں مختلف انداز اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو جاننے کے بعد اس کی رضا میں راضی رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سعدیؒ کی حکایت "اللہ کے در کا سوالی"[۱۴] میں بیان کیا ہے کہ ایک بوڑھا شخص صبح بھیک مانگنے نکلا۔ اسے ایک مسجد نظر آئی۔ اس نے آواز دی۔ بوڑھے کو خیرات مل جائے بابا! ایک شخص پاس سے گزرا اس نے کہا یہاں کوئی نہیں رہتا جو تمہاری مدد کرے۔ بوڑھے نے کہا تو یہ کس کا گھر ہے اس شخص نے جواب دیا یہ اللہ کا گھر ہے۔ فقیر خوش ہو اور اس نے کہا کہ آج تک اللہ کے آدمی کے گھر سے خالی نہیں لوٹا تو اس کے گھر سے کیسے لوٹ جاؤں۔ یوں اس بوڑھے فقیر نے ایک سال وہیں گزارا۔ یہاں تک کہ اس پر بزرگی کی حالت غالب آنے لگی۔ ایک روز وہ اسی حالت

میں زندگی کی آخری سانسوں میں تھے کہ ایک شخص چراغ لایا اور خوشی سے کہا کہ جس نے بھی سخی کا در کھٹکھٹایا وہ مایوس نہیں ہوا شرط صرف یہ ہے کہ وہ صابر ہو۔ اس حکایت میں اطاعت کا بیان موجود ہے۔ فقیر نے اللہ تعالیٰ کہ وحدانیت کو مانا اور اس کی ذات کے در کا سوالی بن کر بٹھار ہا آخر کو اسے اپنی مراد حاصل ہو گئی۔ یوں دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی کی نظم "رہے نام اللہ کا" میں سعدیؒ کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا میں کوئے خاص نہ کوئی عام رہے گا
نہ صاحب مقدور نہ ناکام رہے گا
زر دار، نہ بے زر، نہ بد انجام رہے گا
شادی نہ غم گردش ایام رہے گا
نہ عیش نہ دکھ درد، نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا[۱۵]

نظیرؔ نے ان اشعار میں اللہ تعالی کی وحدانیت اور یکتائی کا بیان کیا ہے۔ اس دنیا میں عام و خاص، امیر و غریب، ہنسی و خوشی، رنج و الم اور آرام سب یہیں ختم ہو جائے گا، اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی۔ وہی ایک ذات ہے جس نے قائم و دائم رہنا ہے۔ علاوہ ازیں یہ نظم طویل ہے اس لیے اس کا مختصراً احوال بیان کرتی چلوں یعنی مزید یہ کہا کہ نہ محلات، نہ مکانات، نہ غنچہ، نہ باغ، نہ گل، نہ پھول و پھل، نہ جھونپڑے، نہ ملک اور نہ دولت کچھ باقی نہیں رہے گا۔ نظیر نے نظم کے مصرعے میں کہا **"آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا"**[۱۶] اللہ تعالیٰ اس دنیا و کائنات کا خالق و مالک ہیں۔ اس دنیا میں موجود ہر ایک شے ہمارا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا حتیٰ کہ ہماری سانس بھی اسی کی ذات کی دی ہوئی ہے۔ یہ تمام کی تمام چیزیں دنیاوی اور مادی ہیں۔ ان سب کا ایک وقت مقرر ہے اس کے بعد یہ سب فنا ہو جائے گا اور باقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہ جائے گی۔

سعدیؒ کی حکایت "جال میں مچھلی"[۱۷] میں بیان کیا ہے۔ کہ ایک ماہی گیر کے جال میں ایک بڑی مچھلی پھنس گئی مگر وہ مچھلی طاقت ور تھی اس لیے جال بھی اپنے ساتھ لے گئی، ساتھی ماہی گیروں نے ملامت کی تو اس نے کہا بھائیوں مچھلی کی زندگی ابھی باقی تھی اور شکاری کی قسمت میں روزی نہ ہو تو دریائے دجلہ سے بھی شکار نہیں ملتا۔ اس حکایت میں اصل مقصد یعنی تقدیر الٰہی کو بیان کیا ہے کہ کبھی کبھی انسان محنت کے باوجود کچھ حاصل نہیں کر سکتا ہے یعنی یہ بات سمجھنے کی ہے کہ انسان تقدیر الٰہی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہر کام میں ہماری مدد کرتی ہے۔ جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہم صرف و صرف محنت کر سکتے ہیں باقی اس کے نتیجے کا انحصار اللہ تعالیٰ کی ذات

پر ہے۔ ایسے میں دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی کی نظم "خدا کی دی ہوئی نعمتیں" میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ جو بنی نوع انسان کے لیے اس دنیا میں بھیجی گئی ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ نعمتیں عیاں ہیں جو عالم کے واسطے
ہیں گی یہ سب میاں اسی آدم کے واسطے
کچھ تن کے واسطے کچھ اشکم کے واسطے
ہیں بیش بیش کے لیے کم کم کے واسطے
سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور دم بنا ہے آہ فقط غم کے واسطے[۱۸]

نظم کے ان اشعار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم انسانوں کو دی ہوئی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب قیمتی نعمتیں ہم جیسے انسانوں کے لیے ہیں۔ نظیرؔ کی یہ نظم طویل ہونے کے باعث مکمل تحریر نہیں کی جاسکتی اس لیے اس نظم میں بیان کردہ بے شمار نعمتوں کا مختصر اً تذکرہ کرتی چلوں۔ ان میں پری زاد، سرخ فام، مطرب شراب، صراحی جام، عیش و عشرت، چوچلے، عطر و چمن، دولت کی دھوم دھام، گل دان، پان دان، عطر دان، زرفشاں، حقے بھرے چمکتے ہیں، مشک و گلاب، باغ و بوستان، سرخ و سفید لال، جوہرات، یاقوت، یمنی، لعل، نیلم، فلک مثال، فیروزہ، مونگا موتی و پکھراج، میوے، بادام، پستے، چھوہارے، کھوپرے، خربوزے، آم، جامن، لیموں، چکوترے، نارنگی، انار بہی، اور سنگترے وغیرہ جیسی بے شمار نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ نظم کے چند آخری اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا میں جتنے لوگ ہیں کیا شاہ کیا فقیر
سب سکھ میں ہیں پر ایک نہ اک دکھ میں ہے امیر
کیا عشرتیں بہار کی کیا عیش دل پذیر
جن جن کا تم نے نام لیا اب میاں نظیر
سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور دم بنا ہے آہ فقط غم کے واسطے[۱۹]

اس اقتباس میں کہا کہ دنیا میں جتنے بھی شاہ، فقیر، امراء، غرباء موجود ہے ان میں کوئی خوش ہے اور کوئی نہ کوئی سوگوار ہے۔ بہار کی کیا ہی خوبیاں ہیں۔ اس میں طرح طرح کے پھل اور پھول کھلتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں ہم تک اسی کے حکم سے پہنچی ہیں۔ یہ سب تقدیر الٰہی ہے کہ اس نے ہم جیسے گنہگار انسانوں کو اپنی نعمتوں سے نوازہ ہے۔ اس نظم پر سعدیؒ کے مکمل طور پر اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے سعدیؒ کی

حکایت "جال میں مچھلی" میں تقدیر الٰہی کا بیان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسے میں نظیرؔ کی نظم میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں گردانے کا مقصد سرف و صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اسے اپنی نعمتوں سے نواز دیتا ہے۔

سعدیؒ کی ایک اور حکایت "خدا کی یاد"[20] میں بیان کیا ہے کہ میں ایک قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ صحرا میں ہمارا کارواں ساری رات سفر کرتا رہا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی ایک مناسب مقام پر سب آرام کے لیے رک گئے۔ انھی میں ایک شخص نے نعرہ لگایا اور ایک طرف بھاگ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو میں نے اسے کہا کہ مجھے تمہاری یہ بات عجیب لگی۔ اس نے جواب دیا کہ صبح ہوتے ہی چرند پرند خدا کی حمد و ثنا میں نغمہ سرا ہو جاتے ہیں۔ بلبلیں باغوں میں، چکور پہاڑوں میں، مینڈک پانی میں، چوپائے جنگل میں، سب جانور ہمہ تن پر جوش انداز میں عبادت کر رہے ہیں اور ہم سو رہے ہیں۔ یوں نظیر اکبر آبادی کی نظم "چڑیوں کی تسبیح" پر سعدی شیرازی کے اثرات جا بجا نظر آتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں کرتی ہیں
ہوں ہوں ہوں ہوں ہوں، کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولے ککڑوں ککڑوں مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یادیں اس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

قمری بولے حق سرہ، بلبل بولے بسم اللہ
کبک ٹیٹری چاروں قل، اور تیتر بھی سبحان اللہ
دارد مور پپیہے، کوئل کوک رہے اللہ اللہ
فاختہ کو کو تیہو ہو، طوطے بولیں حق اللہ
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں[21]

اس نظم پر سعدیؒ کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ جس طرح ان کی حکایت "خدا کی یاد" میں پرندوں کی عبادت کا ذکر کرتے ہوئے انسان کو اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بلکل ایسے ہی نظیرؔ کی نظم "چڑیوں کی تسبیح" میں بھی چڑیوں اور مختلف پرندوں کی عبادت کا ذکر کرتے ہوئے وہی مقصد بتایا جو سعدی شیرازی نے بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ نظم طویل ہے اس لیے اس کو مکمل طور پر لکھنا ممکن نہیں اس لیے اس نظم میں موجود چرند پرند کا ذکر مختصراً بیان کرتی چلوں۔ ان میں شکرا چیخ، گھڑ باشے، باز، کونج، کبوتر، سبزک، چھانپو، کلکل، سارو، لعل پڑھے صم بکم، پدڑی، پدی، پودے شکر خورے بولیں توئی توئی، پنکھ پکھیرو سب پڑھتے قرآن، ہنس، ہما، سرحاب تدرویں بولیں یا رحمان، سارو، ہریل، لٹورے، دھیڑیا حنان،، قفقس، تتر، چکوہ بولیں منان، ہد ہد بولیں احد احد، بوم چغد، اور سبزک ابابیل اور چکوریں، بھنجن، جھپاں، کلنگ، تتلی، ٹڈ، ڈانس، بھنبھیری، کتری، بھنوری، مکھی، مچھر، پسو، بھنگے، اگھن بئے، چنڈول، ابلقے یاد سب اس کے روتے ہیں۔ المختصر نظیر اکبر آبادی نے اس نظم میں بے شمار حشرات کے نام گنوا کر ان کی اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کا ذکر کیا ہے۔ ایک مصرعے میں دبے الفاظ میں انسانوں سے کہا! **"ہد ہد بولیں احد احد کچھ تو بھی تو کر دھیان میاں"**[۲۲] یعنی شاعر نے پرندوں کی عبادت کا ذکر کرتے ہوئے انسانوں کو بھی تلقین کی کہ کچھ تم بھی خوف خدا کر اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ نظم کے آخر میں بہت سے چرند پرند کا ذکر کرنے کے بعد کہا:

کس کس کا لوں نام غرض ہیں جتنے طائر خورد و کبیر
کوئی کہے ،یا حی توانا کوئی کہے یا رب قدیر
پنکھی تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں رہیں اسیر
ہم سا غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہو گا آہ !نظیر
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں[۲۳]

سعدی کی اس حکایت "حقیقی کارساز" میں بیان ہوا ہے کہ ایک شخص نے حاکم شیراز اتابک سعد بن زنگی کی شان میں قصیدہ کہا تو اس نے خوش ہو کر اسے قیمتی خلعت انعام کے طور پر دی اس پر لکھا تھا 'بس اللہ' قصیدہ گو کی نظر اس پر پڑی تو خلعت اتار کر جنگل بھاگ گیا وہاں اس کی ملاقات درویشوں کے ایک گروہ سے ہوئی اور سارا احوال ان کو سنا دیا۔ ایک درویش نے کہا کہ تم نے بادشاہ کا انعام کیوں نہیں لیا؟ تو وہ بولا مجھ پر حقیقی کارساز آشکار ہو گیا ہے سب کچھ اس ذات کے ہاتھ میں ہے۔ ہم تو یوں ہی انسانوں سے امید لگاتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

جب خدا ہی ہے کارساز اپنا

پھر کسی سے سوال کیوں کیجیے
چھوڑ کر مالک حقیقی کو
خود کو وقف ملال کیوں کیجیے [۲۴]

نظیر اکبر آبادی کی نظم "ہو اللہ الخالق الباری" پر سعدی شیرازی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا کھچم کھچا ہے
یہ ٹھاٹ تجھی نے باندھا ہے یہ رنگ تجھی نے رچا ہے
حیواں، پکھیرو، نر ناری، کیا بوڑھا بالک بچا ہے
کیا دانا، بینا، ہوش بھرا، کیا بھولا، نادان کچا ہے
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے [۲۵]

اس پوری نظم میں دنیا میں موجود ہر ایک شے کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتی ہیں۔ ان میں چرند پرند، جانور، پھل، پہاڑ، جنگل، صحرا جانوروں کا نام لیتے ہوئے کہا کہ پوری دنیا تیری یاد کرتی ہے۔ اس دنیا میں سارے رنگ تجھی سے ہیں۔ کل عالم یعنی حیواں، پکھیرو، نر ناری، بوڑھے، بچے، دانا، بینا، ہوش والا، بھولا اور ناداں سب تمھیں یاد کرتے ہیں کیوں کہ تمھاری ذات سچی ہے۔ جیسا کہ سعدی شیرازی کی حکایت "حقیقی کارساز" میں اللہ تعالیٰ کی ذات تعریف بیان کی گئی ہے۔ بالکل ایسے ہی نظیر اکبر آبادی کی نظم میں بھی اسی نقطہ نظر کو بیان کیا گیا ہے۔

اس باب میں نظیر اکبر آبادی کی مذہبی منظومات پر سعدیؒ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اوپر پیش کردہ نظموں کے علاوہ بھی نظیر کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان میں اسرار قدرت، توکل ترک و تجرید، نظیر محراب عبادت میں، گلدستہ قدرت، عید الفطر، شب برات، نظیر بارگاہ رسالت میں وغیرہ جیسی بہت سی نظمیں تحریر کی ہیں۔ اب ان میں سے دیگر منظومات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیونکر کرے نہ اپنی نموداری شب برات
چلپک چپاتی حلوے سے ہے بھاری شب برات
زندوں کی ہے زباں کی مزیداری شب برات
مردوں کی روح کی ہے مددگاری شب برات

لگتی ہے سب کے دل کو غرض پیاری شب برات[۲۶]

شب برات: اس نظم میں ہمارے اسلامی دن شب برات کا خوبصورت انداز میں احوال بیان کیا ہے۔

ہے عابدوں کی طاعت و تجرید کی خوشی
اور زاہدوں کو دید کی تمہید کی خوشی
رند عاشقوں کو ہے کئی امید کی خوشی
کچھ دلبروں کے وصل کی کچھ دید کی خوشی
ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی[۲۷]

عید الفطر: یہ نظم بھی ہمارے اسلامی تہوار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے نظیر اکبر آبادی نے اس نظم میں عید الفطر کی خوشی کو نہایت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔

اوپر پیش کردہ منظومات کے اشعار سے باخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے بے شمار منظومات ایسی تحریر کی ہے، جو مذہب سے جوڑی ہوئی ہیں اور ان پر سعدیؒ کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نظیر اکبر آبادی کی نظمیات پر سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی اقدار کے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سعدیؒ کی حکایت "غلام کے ساتھ سختی"[۲۸] میں بیان کیا ہے۔ ایک نیکوکار شخص کسی امیر کے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس کی نظر ایک امیر کے غلام پر پڑی۔ جو اپنے غلام کو باندھ کر مار رہا تھا۔ نیک آدمی نے دل میں سوچا اگر غلام تمھارے ماتحت ہے بھی تو اس پر ظلم نہ کر بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس نے تمھیں یہ فضیلت دی۔ یہ نہ ہو آخرت کے دن تمھیں جہنم ملے اور غلام کو جنت ملے۔ لہٰذا سعدیؒ نے اس حکایت کے ذریعے سے حاکم کو یہ نصیحت کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمھیں بلند مرتبہ اور دولت سے نوازہ ہے تو اس پر اتراؤ مت بلکہ محکوم اور غلام سے نرمی سے پیش آؤ۔ کیوں کہ روز آخرت تمھاری یہ عارضی مال و دولت اور جاہ و جلال نہیں رہے گا وہاں تو نامہ اعمال کو دیکھا جائے گا۔ یوں دیکھا جائے تو یہی اثرات نظیر اکبر آبادی کی منظومات پر نظر آتے ہیں ان کی نظم "بنجارانامہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں کیوں دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئی پلاّ سر بھارا
کیا گیہوں، چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا[۲۹]

نظیرؔ کی اس نظم پر سعدیؒ کے واضح اثرات نظر آتے ہیں جیسے انھوں (سعدی شیرازی) نے اپنی حکایت "غلام کے ساتھ سختی" میں حاکم کو یہ باور کروایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنی رحمتوں و نعمتوں سے نوازہ ہے تم اس پر شکر ادا کرو۔ اس طاقت کو مظلوم و محکوم پر استعمال نہ کرو اور نہ ہی ان سے برابر تاؤ کرو، نہ ہی اس کے مالک بنو۔ اللہ تعالیٰ نے جسے جس قدر نوازہ ہے اسے اس قدر آخرت میں حساب لیا جائے گا۔ جب موت کا فرشتہ آئے گا تو یہ بدھیا، بھینسا، بیل شتر، گوئی، پلاؔ گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، آگ، دھواں اور انگارے سب یہیں رہ جائے گا۔ شکر مصری قند گری، سانبھر میٹھا کھاری، کیا داکھ منقا سونٹھ مرچ، کیا کیسر، لونگ سپاری اور دھن دولت کسی کام نہ آئے گی۔ جب موت آئے گی تو تمھاری کسی کو پروا نہیں ہو گی بلکہ تمھاری جمع پونجھی کو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا ۔ تمھارے اکھٹے کیے گئے چاندی کے تھال اور کٹورے، پیتل کی ڈبیا، سونے کے برتن، روپے، مٹی اور چینی کی ہنڈیا کسی کام نہیں آئے گی جب تمھاری چلتے پھرتے روح قفس کی جائے گی۔ اس وقت انسان کی یہ جھوٹی شان و شوکت اس فانی دنیا میں رہ جائے گی۔ اسی حوالے سے نظیرؔ کے چند مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل زمرد سیم و رز
جب پونجی بات میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جاں اوپر
نقارے نوبت بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکان کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا[۳۰]

نظیرؔ نے اس بند میں کہا کہ دولت، حشمت، تخت، چھپر، لعل زمرد سیم وزر، نقارے، فوجیں اور لشکر کچھ کام نہیں آئے گا موت شے ہی ایسی ہے کہ یہ سب دنیاوی مال و دولت یہیں رہ جائے گا۔ پھر کہا کہ ان تلواروں پر مغرور نہ ہو۔ ان کے زور پر تم نے ہیرے، خزانے، شجر، باغیچے حاصل کر لیے ہیں۔ اپنی حفاظت کے لیے مضبوط مکان، قلعے، خندق، کنگورا بنوا لیے۔ لیکن یہ نفع، لونڈی، باندی، مندر، مسجد باغ اور چمن سب دنیا میں رہ جائیں گے جب قزاق اجل کا آئے گا۔ ابواللیث صدیقی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "انسان ایک بنجارا ہے جو بستی بستی، نگر نگر مارا مارا پھرتا ہے۔ اس کا گھر اور وطن کہیں نہیں سارا ساز و ساماں وہ اپنے ساتھ لادے پھرتا ہے اور کون جانتا ہے کہ کس منزل پر اجل کا قزاق آکر لوٹ لے، پھر سارا ساز و سامان پڑا رہ جائے گا۔ زن و فرزند، عزیز و اقارب کوئی پاس نہیں بھٹکے گا۔"[۳۱] یعنی ابواللیث صدیقی نے بھی یہی کہا کہ انسان ایک بنجارا (خانہ بدوش) ہے جو اپنی ساری عمر سامان اکھٹا کرنے میں گزار دیتا ہے اور اسے ساتھ لیے پھرتا ہے لیکن جب موت آتی ہے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو گا نہ ہی

اس کے رشتے دار نہ ہی اس کے بہن بھائی۔ نظیر اکبر آبادی کی بہت سی منظومات ایسی ہیں ان میں مال و دولت کے بجائے آخرت پر زور دیا گیا ہے۔ انسان جب مر جائے گا تو کوئی شے اس کے کام نہیں آئے گی اس کی موت کے بعد ہر کوئی اس کا مال سمیٹنے اور دفنانے کی تیاری کرے گا۔ آخرت کے دن اس کے اعمال کا پوچھا جائے گا نہ کہ مال و دولت اس لیے انسان کو لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ نظیر اکبر آبادی کی یہ نظم ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ نظم کے آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیرا کیلا جنگل میں تو خاک لحد کے پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا[۳۲]

سعدیؒ کی حکایت "ظالم بادشاہ کو نصیحت"[۳۳] میں بیان کیا ہے کہ میں (سعدی شیرازی) دمشق کی مسجد حضرت یحیٰ علیہ السلام کے مزار پر اعتکاف بیٹھا ایک دن ایک عرب کا بادشاہ نماز پڑنے کے بعد دعا کرنے لگا۔ اس بادشاہ کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنی رعایا پر رحم نہیں کرتا تھا۔ دعا کر کے میری طرف متوجہ ہو کر کہا دشمن کی طرف سے مجھے خطرہ ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ بزرگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہے۔ تو آپ (سعدی شیرازی) نے اسے نصیحت کی کہ رعایا پر رحم کیا کرو، جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں ہوتا ہے اپنی اس غفلت سے نکل اور عدل و انصاف سے کام لے۔ یعنی اس حکایت میں کہا گیا ہے کہ تم اپنے لیے آسانیاں چاہتے ہو تو عدل و انصاف کو قائم کرو۔ یہی نکتہ نظر نظیر اکبر آبادی کی نظم "تن کا جھونپڑا" میں نظر آتی ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ تن جو ہے ہر اک کے اتارے کا جھونپڑا
اس سے ہے اب بھی سب کے سہارے کا جھونپڑا
اس سے ہے بادشہ کے نظارے کا جھونپڑا
اس میں ہی ہے فقیر بچارے کا جھوپڑا
اپنا نہ مول کا نہ اجاڑے کا جھونپڑا
بابا یہ تن ہے دم کے گذارے کا جھونپڑا[۳۴]

ان اشعار میں بھی عدل و انصاف اور مساوات کا پرچار کیا گیا ہے۔ تن سے مراد جسم، اور جھونپڑے سے مراد رہنے کی عارضی جگہ کے ہیں۔ یہ جو تن کا جھونپڑا ہے یہ سبھی کے سہارے کا جھونپڑا ہے، امیر و امراء، غریب و غرباء، بادشاہ، فقیر سب کے گزارے کا جھونپڑا ہے۔ اس میں ہی زندگی کے گزارنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اسی میں سیانے، بھولے بھالے رہتے ہیں۔ اسی میں عاجز، ہوشیار، دیوانے اور دشمن ہیں۔ اسی میں اپنے، بیگانے اور شاہ بستے ہیں۔ اسی میں عشق و محبت کرنے والے لوگ، شوخ، حسن، چاند، ستارے رہتے ہیں۔ اس تن کے کھونپڑے میں ہر طرح کے لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تن کے جھونپڑے کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس میں ہی اہل دولت و منعم امیر ہیں
اس میں ہی رہتے سارے جہاں کے فقیر ہیں
اس میں ہی شاہ اور اسی میں وزیر ہیں
اس میں ہی ہیں صغیر اسی میں کبیر ہیں
اپنا نہ مول کا نہ اجاڑے کا جھونپڑا
بابا یہ تن ہے دم کے گذارے کا جھونپڑا[۳۵]

نظیر اکبر آبادی نے مزید لوگوں کو گردانا ہے کہ اسی میں اہل دولت، منعم، امیر آبادی ہیں۔ اسی میں ساری دنیا کے فقیر، شاہ، وزیر، پناہ گزین ہیں۔ اسی میں اعلیٰ و ادنیٰ قیام پذیر ہیں۔ اسی میں چور، ٹھگ، رونی شکل والے، خوش طبع مزاج، ڈھول، نقارے، کلول اور باجے والے رہتے ہیں۔ اسی میں پارسا، عیار، بے درد، اور درد مند قیام کیے ہوئے ہیں چرند پرند، شاہ بھی اسی تن کے جھونپڑے میں بند ہیں ۔ نظم کے اختتام میں کہا کہ اسی میں تمام شاہ، وزیر، وکیل، بخشی، متصدی، امیر و فقیر بستے ہیں۔ یعنی اس نظم میں نظیرؔ نے عدل و انصاف اور مساوات کا درس دیا ہے کہ انسان کا جسم ایک جھونپڑے کی مانند عارضی شے ہے وہ اس میں آکر بس جاتا ہے۔ یہ عارضی دنیا فنا ہونے والی ہے۔ باوجود اس کے وہ اس میں آکر بس جاتا ہے۔ حالاں کہ اسے ایک نہ ایک دن کوچ کر جانا ہے۔ تمام اشرف المخلوقات اس تن کے جھونپڑے کی اسیر ہے۔ اس نظم پر سعدی شیرازی کی حکایت "مغرور کا انجام" کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ حکایت میں بادشاہ نے عدل و انصاف اور مساوات کو اختیار نہیں کیا تو اس سے سب کچھ چھین لیا گیا ہے ایسے ہی اس نظم میں بھی عدل و انصاف کا پرچار کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان اس جھونپڑے میں آکر قیام کرتا ہے۔ اس میں انھوں صرف تن کے جھونپڑے کو غریبوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ عدل و انصاف اور مساوات کے دائرے میں رہتے ہوئے امیر و غریب، بادشاہ و وزیر، نیک، بد سب کو اس جھونپڑے سے جوڑا ہے۔ نظم کے آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس جھونپڑے میں رہتے ہیں سب شاہ اور وزیر
اس میں وکیل بخشی و متصدی اور امیر
اس میں ہی سب غریب ہیں اس میں ہی سب فقیر
شا جھونپڑے جو کہتے ہیں سچ ہے میاں نظیر
اپنا نہ مول کا نہ اجاڑے کا جھونپڑا
بابا یہ تن ہے دم کے گذارے کا جھونپڑا[۳۶]

شیخ سعدی کی حکایت "بے تدبیر بادشاہ"[۳۷] میں ایک بادشاہ کی داستان بیان کی ہے کہ اسے نہ اپنے ملک کے انتظامات کی توجہ تھی اور نہ ہی وہ اپنے سپاہیوں کی خبر لیتا تھا۔ جس سے اس کی مملکت کمزور ہو گئی یہ بات دشمنوں کے علم میں آئی تو انھوں نے اس وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک پر حملہ کر دیا۔ اس کے فوج کے بہت سے افسر اور سپاہی دشمن سے جا ملے۔ سعدی فرماتے ہیں ان میں سے ایک شخص میرا واقف تھا میں نے اس پوچھا یہ کیسی مردانگی ہے کہ تو نے جس کا نمک کھایا اسی کو دھوکا دیا۔ اس نے جواب دیا۔ یہ واقعی برا عمل ہے لیکن میں بھی کیا کرتا میرے گھوڑے کا بھوک سے برا حال تھا۔ تو ایسی حالت میں میں کیا کرتا۔ اس حکایت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ملک میں امن و امان کی صورت حال کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بادشاہ ملک پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کے حالات سے بھی باخبر رہے۔ اگر بادشاہ ایسا نہ کرے تو اس ملک کے کریا کریا، گلی گلی، کوچوں میں فتنے اور ہنگامے ہوں گے۔ جہاں سیاسی، معاشی اور سپاہیوں کی حالات ابتر ہو جائیں گے۔ یہی صورتحال ہمیں نظیر اکبر آبادی کی نظم "شہر آشوب" میں نظر آتے ہیں۔ اس میں ملک کے مختلف طبقوں اور پیشوں کی تباہی کا بیان کیا ہے۔ اہل حکمراں ہی نااہل ہوں تو ملک کے حالات کس طرح سے درست ہو سکتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوارو در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند[۳۸]

نظیر اکبر آبادی کی نظم میں ملک کے اقتصادی حالات کا بیان کیا گیا ہے۔ کہ حکمران طبقے نے اس قدر حالات بگاڑ دیے ہیں کہ لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ ان کے حالات اس قدر ابتر ہو چکے ہیں کہ گھر کی چھت تک نہیں، در و دیوار سے مفلسی ٹپک رہی ہے۔ آگرے میں کوئی روزگار باقی نہیں رہا۔ اس بند میں تشبیہ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ

جس طرح سے پانی کا بند ٹوٹ جائے تو کوئی شے سلامت نہیں رہتی بلکل ایسے ہی حالات ہو چکے ہیں۔ملک کے اقتصادی حالت اس طرح بگڑ گئی ہے کہ لوگوں کے پاس سر چھپانے کے لیے گھر نہیں،نہ کپڑے ہیں،نہ تھیلی میں زر،نہ چوروں سے ڈر ہے۔ آگرے کے برے حالات کا بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایسے وقت سے پناہ مانگو کہ ایک ایک روپے کے لیے بھی محتاج ہوں۔ ایسے حالات میں دستکاروں اور اہل ہنر لوگوں کی بھی اہمیت نہیں رہی ہے۔ بہت سے امیر لوگوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہا کہ بنیے، ظراف، ساہوکار، سیٹھ اوور جوہری جو سب کو ادھار دیتے تھے اب خود محتاج ہیں۔ بازار اجاڑ پڑے ہیں، دکان دار اپنی دکانوں میں چوروں اور قیدیوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ نظیرؔ نے سوداگر، پنساری، کاغذی، صحاف، مصور، نقاش، حجام، زردار، ملا، جوہری وغیرہ جیسے بے شمار پیشے گنواتے ہوئے سب کی حالت زار کا پردہ فاش کیا ہے۔ اور آگرے کی بدحالی کا رونا رویا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہیں تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند[۳۹]

نظیر اکبر آبادی نے پیشہ ور لوگوں کے حالات کا ذکر کرنے کے علاوہ سپاہیوں کا بیان کیا ہے کہ مسلسل حملوں کی وجہ سے فوج ان کا مقابلہ نہ کر سکی۔ آگرے کا احوال بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ شہر، حویلیاں، باغبان ویران ہیں یہاں درخت، کیاری، پھول، پھل، اور سبز اسب کچھ اجاڑ پڑا ہے۔ نہ بلبلوں کی آواز، نہ قمریوں کی صدا۔ پورے شہر پر خزاں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جتنے کارخانے اور صنعتیں سب اجاڑ پڑیں ہیں۔ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر ملکی صورت حال کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس نظم پر ابواللیث صدیقی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یہ شہر آشوب اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں متوسط طبقہ اور خاص طور پر دستکاروں اور پیشہ وروں کی تباہ حالی کا بیان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے یہ تباہی واقعی ایسی تھی جس سے زیادہ آلام اور مصائب عوام کے حصے میں آئے تھے۔"[۴۰] یعنی نظیر اکبر آبادی کی اس نظم میں آگرہ کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور بتایا کہ اس ساری صورت حال کا سبب ہمارا حکمران طبقہ ہے جنہوں نے ملک کو صحیح طریقے سے چلایا نہیں اور حالات اس ڈگر تک پہنچ گئے۔ اس نظم پر ہمیں سعدیؒ کی حکایت کے جابجا اثرات نظر آتے ہیں۔ حکایت میں بیان ہوا کہ بادشاہ کی نااہلی اور غیر سنجیدہ رویے کی وجہ سے اس کا ملک مشکلات سے دوچار ہوا تھا اور یہی صورت حال ہمیں اس نظم میں نظر آتی

ہے کہ حاکم اپنے ملک کو چلانے کے صحیح انتظام نہ کر سکی۔ اس وجہ سے آگرہ جیسے شہر کو اس طرح کے حالات در پیش آئے۔ نظم کے آخر میں دعائیہ کلمات کہے ہیں۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے میری حق سے اب یہ دعا شام اور سحر
ہو آگرے کی خلق پہ پھر مہر کی نظر
سب کھاویں پیویں یاد رکھیں اپنے اپنے گھر
اس ٹوٹے شہر پر بھی الٰہی تو فضل کر
کھل جاویں ایک بار تو سب کارو بار بند[۴۱]

سعدی شیرازی کی حکایت "خود دار درویش"[۴۲] میں ختن کے بادشاہ اور درویش کا قصہ بیان کیا ہے۔ ختن کے بادشاہ نے ایک بزرگ کی خدمت میں ریشم کا عمدہ لباس پیش کیا۔ بزرگ نے وہ لباس پہنا اور زمین ادب بوسی دیا اور بادشاہ کی کی تعزیم و تکریم کی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اس خلعت سے بہتر میرا پیوند لگا خرقہ ہے کیوں کہ اس کو پہن کر کسی کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا۔ یعنی اس حکایت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ زیادہ تر اشرف المخلوقات مال و دولت کے پیچھے بھاگتی ہے۔ اسی دولت کو سب کچھ سمجھتی ہے اور اس کے لیے ذلت بھی اٹھانے کو تیار ہوتی ہے۔ در حقیقت دولت عارضی شے ہے یہ کسی کی بھی نہیں کبھی ایک ہاتھ تو کبھی دوسرے ہاتھ۔ اصل میں تو ہمارے اعمال ہی ہیں جو آخرت کے روز ہمارے کام آئیں گے۔ یہ نظریہ جو سعدی شیرازی کے ہاں موجود ہے یہی نظریہ ہمیں نظیر اکبر آبادی کی نظم "زر کی فلاسفی" میں نظر آتا ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا میں کون ہے جو نہیں ہے فدائے زر
جتنے ہیں سب کے دل میں بھری ہے ہوائے زر
آنکھوں میں دل میں جان میں سینے میں جائے زر
ہم کو بھی کچھ تلاش نہیں اب سوائے زر
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر[۴۳]

ان اشعار میں زر کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ دنیا میں موجود تمام لوگ زر کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ہر انسان دولت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا ہے اور یہی بات نظیر نے کہی کہ انسان کو دنیا میں دولت کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں حالاں کہ دولت ایک عارضی شے ہے جو اس فانی دنیا کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ کوئی بھی شخص آخرت کے لیے تیاری نہیں کرتا سب کے سب لوگ دولت سے ہی محبت کرتے ہیں اور اپنی زندگی کا محور و

مقصد دولت کو بنا رکھا ہے۔ جس کے پاس دولت ہے اس کے غلاموں کو بھی سلام کرنا چاہتے ہیں۔ نظیرؔ نے کہا کہ اس سے استاد بھی نرمی سے پیش آتے ہیں۔ زر کو دیکھ کر فولاد نرم ہو جاتا ہے۔ دولت کے حصول کے لیے روم، شام تک جاتے ہیں۔ چین سے دولت کے جہاز آتے ہیں۔ کوئی روزی اور رزق کے لیے دکن جاتا ہے۔ زر ایسی چیز ہے کہ اس سے دشمن کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اس پوری نظم میں زر کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے کہ زر انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہر انسان اس کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا ہے۔ دن، رات، صبح، شام ہر کوئی دولت کو پکار رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوتی ہیں زر کے واسطے ہر جا چڑھائیاں
کٹتے ہیں ہاتھ پاؤں گلے اور کلائیاں
بندوقیں اور ہیں کہیں توپیں لگائیاں
کل زر کی ہو رہی ہیں جہاں میں لڑائیاں
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر[۴۴]

مختلف قوموں اور ملکوں میں لڑائیوں کی ایک اہم وجہ یہی زر رہا ہے۔ ایک قوم خود کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے دوسری قوم پر حملہ کرتی ہے۔ حملے کے دوران توپیں اور بندوقیں لگائی جاتی ہیں۔ اس حملے کی بدولت کئی لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔ کچھ کے ہاتھ کٹتے، کچھ کے پاؤں، کچھ کے بازو اور کچھ کے گلے کٹتے ہیں۔ یہ لڑائی صرف و صرف زر کی ہے۔ ایک ملک اپنی ترقی اور خوشحالی کے لیے دوسرے ملک سے بہتر بننے کی خواہش میں زر کو اکھٹا کرتا ہے۔ یوں وہ طاقت ور ملک بن کر کمزور پر حملہ کرتا ہے اور اس کی تمام چیزوں پر قابض ہو جاتا ہے۔ حملہ کرنے والے ملک کو معصوم لوگوں کی جان کی کوئی پروا نہیں ہوتی بلکہ طاقت کے نشے میں اور زر کے حصول کی خاطر وہ آخرت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ دنیا میں جتنی بھی خلقت یعنی اشرف المخلوقات وہ چاہے بادشاہ ہو یا وزیر، چاہے وہ پیر ہو یا مرید، چاہے وہ مفلس ہو یا محتاج، چاہے وہ فقیر ہو یا غریب سب دن رات زر کے اسیر ہیں۔ ایسے حالات میں ملک نہ صرف اقتصادی، سیاسی اور معاشی طور پر متاثر ہوتا ہے بلکہ اخلاقی سطح پر بھی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس نظم پر سعدیؒ کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ حکایت میں بھی یہ بتایا کہ انسان دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے جبکہ درویش ایمان بچاتا ہے۔ نظم "زر کی فلاسفی" میں بھی یہی کہا کہ تمام انسانیت زر کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور اسے آخرت کی پروا نہیں، نظم کے آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جتنی جہاں میں خلق ہے کیا شاہ کیا وزیر

پیرومرید و مفلس و محتاج اور فقیر
سب ہیں گے زر کے جال میں جی جان سے اسیر
کیا کیا کہوں میں خوبیاں زر کی میاں نظیرؔ
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر[۴۵]

نظیر اکبر آبادی کی منظومات سماجی اقدار اور اخلاقی اقدار کی آئینہ دار ہیں۔ جس طرح سعدی شیرازی کی گلستان و بوستان میں پیش کردہ حکایات میں مذہبی، سماجی و اخلاقی اقدار کا بیان موجود ہے بلکل یہی انداز بیان ہمیں نظیر اکبر آبادی کی منظومات میں بھی نظر آتا ہے۔ سعدی شیرازی نے لوگوں کی اصلاح کے لیے جس فکر کو اختیار کیا ہے۔ اس سے اردو ادب کے بہت سے مصنفین شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ انھوں نے وہی نظریہ اختیار کیا ہے جو ہمیں سعدی شیرازی کی حکایات میں دیکھائی دیتا ہے۔ اوپر بیان کردہ منظومات (بنجارانامہ، تن کا جھونپڑا، زر کی فلاسفی وغیرہ) پر سعدی شیرازی کے مذہبی، سماجی اقدار اور اخلاقی اقدار کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی نظیر اکبر آبادی کی بہت سی منظومات ایسی ہیں جن میں سماجی و اخلاقی اقدار کا بیان موجود ہے۔ ان میں عالم گذران، چڑیوں کی تسبیح، تلقین توحید، روٹی کی فلاسفی، پیسے کی فلاسفی، دنیا دارالمکافات ہے، رہے نام اللہ کا، فنا وغیرہ جیسی بہت سی منظومات اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان (نظیر اکبر آبادی) کی کئی ایک نظمیات سماجی و اخلاقی اقدار سے ہٹ کر ہیں۔ ان میں مناظر فطرت (برسات کی امس، کورا برتن، پنکھا، برسات کا لطف، آندھی، برسات کا تماشا، اندھیری وغیرہ) اور مذہبی تہوار و کھیل (شب برات، عید الفطر، حضرت سلیم چشتی کا عرس، تاج گنج کا روضہ، گرونانک شاہ، ہولی دیوالی، کبوتر بازی، بلبلوں کی لڑائی، گلہری کا بچہ وغیرہ) کی منظومات شامل ہیں۔ ان موضوعات پر بھی انھوں نے عمدہ شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ لیکن ہمارا اصل مقصد ان کی شاعری پر سعدی شیرازی کے سماجی و اخلاقی اقدار کا جائزہ لینا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔طلعت حسین نقوی،نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ ص۱۵۔

۲۔نظیر اکبر آبادی،دیوان نظیر اکبر آبادی مرتبہ فرحت اللہ بیگ(دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۴۶ء)،ص۸۔

۳۔ایضاً،ص۶۔

۴۔پروفیسر شہباز،زندگانی بے نظیر(لکھنؤ:منشی نول کشور،۱۹۰۰ء)،ص۱۵۲۔۱۵۳۔

۵۔طلعت حسین نقوی،نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ،ص۴۷۔

۶۔ایضاً،ص۴۱۔

۷۔شریف احمد صدیقی،فرہنگ روح نظیر(نئی دہلی:جواہر لال نہرو یونی ورسٹی،۱۹۸۹ء)،ص۱۲۔

۸۔نظیر اکبر آبادی،نظیر فہمی جلد دوم مرتبہ شمس الحق عثمانی(دہلی:کتاب گھر،۲۰۱۶ء)،ص۶۹۸۔

۹۔ایضاً،ص۷۲۳۔

۱۰۔نظیر اکبر آبادی،نظیر فہمی جلد اول مرتبہ شمس الحق عثمانی،ص۹۱۔

۱۱۔نظر زیدی،حکایات گلستا ن سعدی،ص۱۳۳۔

۱۲۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۶۱۹۔

۱۳۔ایضاً،ص۶۲۲۔

۱۴۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی(لاہو:فیروز سنز،س۔ن۔)،ص۷۰۔

۱۵۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۵۲۳۔

۱۶۔ایضاً،ص۵۲۳۔

۱۷۔نظر زیدی،حکایات گلستا ن سعدی،ص۱۱۲۔

۱۸۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۶۴۱۔

۱۹۔ایضاً،ص۶۴۲۔

۲۰۔نظرزیدی،حکایات گلستا ن سعدی،ص۸۶۔

۲۱۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۳۷۸۔

۲۲۔ایضاً،ص۳۸۰۔

۲۳۔ایضاً،ص۳۸۰۔۳۸۱۔

۲۴۔نظرزیدی،حکایات بوستان سعدی،ص۸۰۔

۲۵۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۳۷۴۔

۲۶۔ایضاً،ص۴۱۶۔

۲۷۔ایضاً،ص۴۱۸۔

۲۸۔نظرزیدی،حکایات گلستان سعدی(کراچی:فیروزسنز،س۔ن۔)،ص۱۴۱۔

۲۹۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی(لکھنو:نول کشور پریس،۱۹۵۱ء)،ص۵۴۱۔

۳۰۔ایضاً،ص۵۴۲۔

۳۱۔ابواللیث صدیقی،نظیر اکبر آبادی ان کا عہد اور شاعری(کراچی:اردواکیڈمی سندھ،۱۹۵۷ء)،ص۶۲۔

۳۲۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۵۴۳۔

۳۳۔نظرزیدی،حکایات گلستان سعدی،ص۲۷۔

۳۴۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۶۱۱۔

۳۵۔ایضاً،ص۶۱۲۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۱۲۔

۳۷۔ نظر زیدی، حکایات گلستان سعدی، ص ۳۲۔

۳۸۔ عبد الباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۴۶۵۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۶۶۔

۴۰۔ ابو اللیث صدیقی، نظیر اکبر آبادی ان کا عہد اور شاعری، ص ۹۔

۴۱۔ عبد الباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۴۷۱۔

۴۲۔ نظر زیدی، حکایات بوستان سعدی، ص ۱۲۲۔

۴۳۔ عبد الباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۶۵۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۶۵۶۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۶۵۶۔

حواشی:

نظیر اکبر آبادی کی پیدائش کلیات نظیر مرتبہ عبد الباری آسی میں ۱۱۴۷ھ درج ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، سلیم جعفر اور ابو محمد سحر نے بھی اسی تاریخ کی پیروی کی ہے۔ جبکہ انتظام اللہ شہابی نظیر کی پیدائش کی تاریخ ۱۱۴۸ھ لکھی ہے اور نظامی بدایونی نے اس تاریخ کی تائید کی ہے۔

باب سوم:

نظیرؔ اکبر آبادی کی غزلوں پر شیخ سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات

غزل کیا ہے؟ غزل دراصل اردو ادب کی ایک اہم ترین صنف سخن ہے۔ غزل کے لغوی معنی حسن و جمال، فراق وصال اور عشق و فریفتگی کے ہیں۔[1] جبکہ اس کا مفہوم عشق و مستی کی کیفیت، محبوب سے مخاطب ہونا، نغمگی، ترنم اور تغزل کے ہیں۔ ادب (لٹریچر) کا نام سنتے ہی سامعین کے ذہن میں شاعری کا خیال امنڈ آتا ہے۔ شاعری میں قارئین نظم کی نسبت غزل سے دلچسپی اور لگاؤ رکھتے ہیں۔ غزل کی حسن خوبی ہر خاص و عام کے لیے مرکز و محور کی حیثیت رکھتی ہے۔ لفظ غزل دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اول عشق حقیقی یعنی (اللہ تعالیٰ سے عشق)، دوم عشق مجازی یعنی (محبوب سے محبت کا اظہار)۔ اردو ادب کی ترویج و ترقی میں غزل کی صنف نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سید عبداللہ غزل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غزل وہ فریاد نہیں جس کی کوئی لے نہ ہو بلکہ وہ نوائے درد ہے۔ جو خلش الم کے ساتھ ساتھ قلب و روح کے لیے انبساط کا بھی کچھ سامان مہیا کرے۔ یہ انبساط مضمون کے علاوہ لہجہ و بیان پر بھی موقوف ہے۔[2]

اردو زبان و ادب میں غزل پرداز کو غزلیہ شاعری کی ہیت کے لیے درج ذیل خصوصیات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ غزل میں موضوع کی کوئی قید نہیں اور نہ ہی غزل کا کوئی عنوان ہوتا ہے۔ غزل میں ردیف و قافیہ پیمائی کا دھیان رکھنا چاہیے، مطلع یعنی غزل کا پہلا شعر ہم قافیہ اور ہم ردیف ہو، مقطع یعنی غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص لکھتا ہے، غزل میں دو مطلع آجائیں تو اسے حسن مطلع کہتے ہیں۔ غزل کے وزن کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف شعری اوزان اور بحروں کا خیال رکھنا چاہیے۔ انھی باتوں کی بدولت غزل کی صنف نے عام و خواص کے دل میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ جبکہ ان باتوں سے اختلاف رائے کرتے ہوئے نظیر صدیقی کہتے ہیں کہ "غزل کی رعنائی اور توانائی کا دارومدار اچھی زمین کی ایجاد یا انتخاب پر ہے اچھی زمین صرف ردیف، قافیے اور بحر سے نہیں بنتی بلکہ وہ شاعر کی نفسیاتی اور جذباتی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔"[3] غزل کی زمین یعنی ترنم و تغزل اور نغمگی کے لیے ردیف، قافیہ اور بحر ضروری نہیں ہے۔ اس کے لیے شاعر کا شعور، تخیلات اور سوچ و فکر اہمیت رکھتی ہے۔ غزل نگاری کی صنف میں ان تمام صفات کے علاوہ غزل کے موضوعات میں بھی تبدیلی کا عنصر آیا ہے۔ غزل کے مضامین میں تبدل کے حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> غزل بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے لیکن رودکی سے لے کر ناصر کاظمی تک ایک ہزار سال کے طویل عرصے میں غزل میں مضامین کے اعتبار سے اس قدر وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ آج عشق و محبت، فکر و فلسفہ، دین و اخلاق، عرفان و تصوف، سیاست اور معیشت، نفسیاتی اور سماجی مسائل، کائنات کی وسعتیں اور باطن گہرائیاں۔ غرض یہ کہ حیات و کائنات کا ہر پہلو غزل گو شعراء کی دسترس میں ہے۔[۴]

اردو زبان و ادب میں شاعری کے ادوار کی بات کی جائے تو نظیرؔ عہد زریں کے شاعر تھے۔ اس وقت میر تقی میرؔ، آتشؔ، میر حسنؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، مرزا سوداؔ، جراتؔ اور میر دردؔ جیسے شعراء کا بول بالا تھا۔ نظیرؔ کا عہد معاشی اعتبار سے پستی کا شکار تھا۔ اس لیے ہمیں ان کے موضوعات میں معاشرتی بے بسی، اندوہ، سیاسی، معاشی، اخلاقی اور سماجی انتشار کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایسے میں نظیرؔ جو عوامی شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے میلے ٹھیلوں، بازار، تقریبات اور تہوار جیسے موضوعات کو زیر بحث لائے ہیں۔ اسی لیے انھیں ادبی حلقے میں سراہا نہیں جاتا تھا اور اس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ ابن کنول نظیر کی شاعری کی ناقدری کی وضاحت دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

> عہد زریں میں نظیرؔ عام روش سے ہٹ کر عوامی موضوعات پر اس شہر میں رہ کر شاعری کر رہے تھے جہاں میرؔ اور غالبؔ پیدا ہوئے اور جو شہر مغلوں کا دارالسلطنت رہا، لیکن نظیرؔ عوام سے قریب ہونے کے سبب نظر انداز کیے جاتے رہے، ان کی شاعری بازاروں میں، میلے ٹھیلوں میں تو مقبول ہوئی لیکن خواص کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔[۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد زریں میں نظیرؔ جس عزت اور شہرت کے حقدار تھے انھیں حاصل نہ ہو سکی۔ باوجود اس کہ ان کی عوام پسندی اور حقیقت پسند رویے نے انھیں آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ بعد ازاں ابن کنول یہ کہتی نظر آئیں کہ "آج نظیر اکبر آبادی اردو کا ایک اہم نام ہے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں نظیرؔ اور ان کے کلام کی جو ناقدری ہوئی اس کے برعکس بیسویں صدی کا سائنٹفک اور حقیقت پسندانہ مزاج انھیں بڑا شاعر تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔[۶] نظیر اکبر آبادی نے جس انداز بیان کو اپنی شاعری میں اختیار کیا ہے وہ ان کو عوام و خواص میں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ابن کنول نے بھی یہی کہا کہ نظیرؔ کی شاعری کو اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے لیکن دور حاضر میں ان کی شاعری کو حقیقت پسندی کی بدولت تسلیم کیا گیا ہے۔

اردو زبان و ادب میں غزل نگاری کے پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو غزل نے بہت سے ارتقائی منازل طے کیے ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں غزل کی صنف پر بھرپور توجہ دی گئی ہے۔ ممتاز الحق نے اپنی تصنیف

اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل میں "غزل کے ارتقا کا سرسری جائزہ" کے عنوان سے باب سوم تحریر کیا ہے۔ اس باب میں غزل کے ارتقائی منازل کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے غزل کی ابتداء کا سہرا امیر خسرو کے سر کیا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے دکن میں محمد قلی قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی، نصرتی اور ولی دکنی جیسے غزل گو شعراء کے نام گنوائے ہیں جبکہ ایہام گوئی کی تحریک کے زیر اثر شاکر ناجی، مضمون، حاتم، مصطفی خاں یک رنگ اور آبرو کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایہام گوئی کے رد عمل میں بہت سے شعراء نے شاعری کی۔ ان میں مرزا مظہر جان جاناں، انعام اللہ خاں یقین، اشرف علی فغاں اور میر عبدالحئ تاباں کے نام نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں میر تقی میر، سودا، درد، آتش، ناسخ، مصحفی اور غالب، حالی اور علامہ اقبال کے نام نمایاں ہیں۔ اردو شاعری میں غزل کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے رشید احمد صدیقی نے کہا کہ:

> غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کی سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔[۷]

اردو شاعری میں غزل کی صنف نے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے اور بہت سے شعراء جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے غزل نگاری کی صنف کو عروج و ترقی سے ہمکنار کیا ہے۔ اردو ادب میں کئی شعراء ایسے بھی گزرے جنہوں نے غزل میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے مگر انھیں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کہ وہ حقدار تھے ان میں نظیر اکبر آبادی کا نام سر فہرست ہے۔ نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ عوام میں آدمی نامہ اور بنجارا نامہ جیسی ان کی بہت سی نظمیں مقبول ہوئیں۔ انھوں نے اپنی فن مہارت غزل گوئی میں بھی دیکھائی ہے۔ مگر ان کی شاعری میں غزلوں کی نسبت نظموں کو مقبولیت حاصل ہوئی حالاں کہ انھوں نے غزلیں بھی کافی تعداد میں لکھیں۔ ابواللیث صدیقی اپنے ایک مضمون "نظیر کی غزلیں" میں نظیر کی غزلوں کی تعداد کے حوالے سے کہا ہے کہ:

> کلیات نظیر کی ابتدائی ایڈیشنوں میں غزل کی تعداد بہت کم تھی، جو کلیات پہلی مرتبہ مطبع الہی، کنبوہ دروازہ، میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں غزلوں کی تعداد چالیس سے زیادہ نہ تھی مختلف ذرائع سے یہ معلوم تھا کہ نظیر کے دو مکمل دیوان غزلیات کے بھی تھے لیکن پروفیسر شہباز جنھوں نے بڑی محنت سے کلیات نظیر کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا وہ بھی ان دونوں کا پتہ چلا نہ سکا اور اتفاقاً یہ دونوں نایاب دیوان آغا علی حسن دہلوی کے کتب خانہ سے قلمی نسخوں کی صورت میں مرزا فرحت اللہ بیگ کو دستیاب ہو گئے چنانچہ انھوں نے مرتب کر کے ان دونوں کو انجمن ترقی اردو سے ۱۹۴۲ء میں شائع کرا دیا۔ نول کشور کے ۱۹۵۱ء والے ایڈیشن میں کلیات کے

ساتھ یہ بھی شامل ہیں اور متفرقات کے علاوہ ۴۵۹ مکمل غزلیں ردیف وار موجود ہیں، ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظیر نے غزلیں بھی خاصی کہی ہیں۔[۸]

ابواللیث صدیقی کے اس اقتباس پر توجہ دی جائے تو پتا چلتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے نہ صرف نظم نگاری کی صنف میں شہرت حاصل کی بلکہ انھوں نے غزل گوئی میں بھی اپنی ایک علیحدہ اور خوبصورت چھاپ چھوڑی ہے۔ مختلف دیوان، قلمی نسخوں اور کلیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح سے غزلیات جمع کی گئی۔ آخر میں کہا کہ دیگر کلیات، قلمی نسخوں اور دیوان کی سب غزلیات شامل کر کے عبد الباری آسی کے کلیات سن ۱۹۵۱ء میں نظیرؔ کی ۴۵۹ غزلیں درج ہیں۔ یوں تو نظیر کو اپنے عہد میں پذیرائی حاصل نہ ہو سکی مگر آج بھی ان کی شاعری عوام الناس میں پسند کی جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے غزل کی مروجہ روش سے ہٹ کر منفرد انداز اختیار کیا ہے۔ عزیز احمد اپنے مضمون "نظیر کی غزل گوئی" میں لکھتے ہیں: "روایاتی یا غیر روایاتی سمت میں غزل کی حرکت بالکل واضح طور پر نظیر کے کلام میں نظر آتی ہے غزل کو انھوں نے خاصوں سے لیا اور عوام کے قابل بنا دیا۔ یہ دونوں طرز نظیر کی شاعری میں ہیں۔"[۹] یعنی انھوں نے اپنی شاعری کو خاصوں تک محدود نہیں کیا بلکہ اپنی شاعری کو اس طرز میں لکھا کہ خاص و عام سب اس کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

اردو زبان و ادب میں شاعری کی صنف کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ غزل ایسی صنف سخن ہے جس سے ہر خاص و عام کو دلچسپی اور لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اوپر بیان کردہ صفحات میں غزل کے معنی، تعریف، پس منظر اور نظیرؔ کی غزل پردازی کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ غزل کے اسلوب پر بات کی جائے تو غزل میں انتہائی خوبصورت اسلوب برتا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری کے دل پر غزل کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غزلیہ شاعری ابتداء سے دور حاضر تک اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ لیے ہوئے ہے۔ غزل نگاری کی صنف اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اگر مزید غزل پر بات کی جائے تو ہمارا اصل مقصد و منبع کہیں پیچھے چھوٹ جائے گا۔ لہٰذا ہم نظیر اکبر آبادی کی غزلوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ نظیرؔ کی غزلوں پر سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اقدار اثرات نے کس طرح متاثر کیا ہے؟ نظیرؔ کی غزل کا شعر ملاحظہ ہو:

بلبل و پروان جب آپ ہی گریں
اس میں گل اور شمع کا پھر کیا قصور
عشق میں بوڑھے ہوئے تم بھی نظیر
اب تلک تم میں نہ آیا کچھ شعور[۱۰]

نظیر اکبر آبادی کی غزلوں پر شیخ سعدی کے سماجی و اخلاقی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے نظر زیدی کی ترجمہ شدہ تصانیف حکایات گلستان سعدی اور حکایات بوستان سعدی کے سماجی و اخلاقی اقدار کے فریم ورک کے تحت کیا جائے گا۔

اخلاقی اقدار:

حقوق العباد، عجز و انکساری، صبر و تحمل، نیکی، اطاعت، تقویٰ اور عدل و انصاف وغیرہ شامل ہیں۔

سماجی اقدار:

سیاست، غربت، غیبت، ریاکاری، ذات پات، چغل خوری، ظلم، غرور و تکبر اور دنیاوی مال وزر وغیرہ شامل ہیں۔

سعدیؒ اپنے دور کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری کو جس قدر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت کم شعراء ایسے گزرے جو اس مقام و مرتبہ کو حاصل کر سکے۔ بہت سے ایسے شعراء جن کا تعلق سعدیؒ کے عہد سے بہت بعد کا ہے۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ سعدیؒ کے کلام نے تقریباً دنیا کے ہر کونے تک اپنی گونج پہنچائی اور کئی زبانوں میں ان کے کلام کے تراجم بھی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ (سعدی شیرازی) کے کلام نے جہاں پوری دنیا کو متاثر کیا ہے وہیں اردو ادب کے بہت سے شعراء بھی ان کی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں حفیظ جالندھری، مولانا الطاف حسین حالی، مظفر علی خاں، اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مگر یہاں ہمارا اصل مقصد و منبع نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدی شیرازی کے اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ گو کہ سعدیؒ اور نظیرؔ کے عہد میں کافی لمبے عرصے کا فرق موجود ہے۔ باوجود اس کے نظیر اکبر آبادی شعوری و لاشعوری طور پر ان سے متاثر ہوئے ہیں۔

سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اقدار کے اثرات نے نظیرؔ کی غزلوں کو متاثر کیا ہے۔ نظیرؔ کی شاعری پر سعدیؒ کے مذہبی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ سعدیؒ کی حکایت "حق گو درویش"[11] میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ نیکی اور تقوی اختیار کرنے کے لیے انسان کو گوشہ عافیت کے بجائے ظالم کے سامنے حق کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔ جیسا انھوں نے اس حکایت میں حجاج بن یوسف کے متعلق کہا کہ اس کے زمانے میں ایک بزرگ تھے جن کی دعا قبول ہوتی تھی۔ حجاج نے یہ سن کر ان سے دعا کی درخواست کی۔ تو اس بزرگ نے دعا کی کہ اے اللہ اسے موت دے۔ حجاج پریشان ہو کے بولے یہ کیسی دعا ہے؟ بزرگ نے فرمایا کہ یہ تمہارے اور عوام کے حق میں بہتر ہے کہ ان کو تم جیسے ظالم سے نجات مل جائے گی۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو تو کہتا ہے اے غافل یہ میرا ہے یہ تیرا ہے
یہ جس کا ہے اسی کا ہے نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے
نمازی ہے ،شرابی ہے، اچکا ہے ،لٹیرا ہے
فرشتہ ہے،پری ہے ،دیو ہے یا آدمی ہے،جن ہے
بلا ہے ،بھوت ہے،یا من ہے،مزروایا کمیرا ہے
تری کیا ذات ہے کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے
مسافر بے وطن ہے یاترا اس جا پہ ڈیرا ہے[۱۲]

اس شعر میں شاعر نے انسان کی حیثیت پوچھی کہ تم کون ہو۔ یہاں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب نہ تو تمھارا ہے نہ میرا ہے۔ پہلے تم خود کو تو پہچان لو کہ ہو کون۔ یہ اس ذات کا جس نے یہ کائنات تخلیق کی ہے۔ ہمارا یہ ٹھکانا عارضی ہے۔ پھر کہا:

جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہرا لے
تو اس کے بعد پھر کہیو یہ تیرا ہے یہ میرا ہے
نظیر اللہ اللہ،اس جہاں میں دم غنیمت ہے
کہاں ہم اور کہاں پھر تم،کوئی دم کا بسیرا ہے[۱۳]

اس غزل میں نظیرؔ نے یہ بیان کیا ہے کہ انسان، اللہ عزوجل کے سامنے ایک زرہ برابر بھی نہیں ہے اور ہم کس بات پر میرا، تیرا کرتے ہیں حقیقت میں تو سب اس کا ہے۔ ہماری تو جان بھی اپنی نہیں وہ بھی اس ذات کی عطا کردہ ہے۔ آخر میں کہا کہ کہاں تم اور کہاں ہم۔ اس غزل پر شیخ سعدی شیرازی کی حکایت کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ جیسے حکایت میں حق گو درویش نے بادشاہ حجاج بن یوسف سے اس کے خوف کے بغیر اس کے مرنے کی دعا کی اور حق کی آواز بلند کی بالکل ایسے ہی نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنی غزل میں انسان کو اس کی حیثیت بتائی اور حق باری تعالی کی صفات بیان کی کہ ہم یہاں کچھ بھی نہیں سب کچھ اس ذات کا ہے۔

سعدیؒ اپنی حکایت "شکر گزار بندہ" میں بیان کرتے ہیں کہ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ رہا۔ مگر ایک روز میرا جوتا ٹوٹ گیا۔ جوتا خریدنے کی رقم میرے پاس نہ تھی۔ اس لیے میں بہت غمگین ہوا۔ اسی حالت میں کوفے کی مسجد کی طرف روانہ ہو۔ وہاں پہنچ کر میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے پاؤں ہی نہ تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرے پاؤں تو سلامت ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شکر کرے ہر حال میں جس کی اچھی ہے تقدیر
نا شکرا ہے غافل، جاہل، احمق اور نادان[۱۴]

یعنی اس حکایت میں انسان کو شکر کی تلقین کی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جن چیزوں سے نوازہ ہے وہ ان کا شکر ادا کرے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی موجود ہیں۔ جنہیں ہم جتنا بھی نصیب نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بننا چاہیے۔ اس کی رحمتوں اور برکتوں کا ہمیشہ شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ اور یہی اثرات ہمیں نظیر کی غزل پر دیکھائی دیتے ہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اسی کی ذات کو ہے دائم ثبات و قیام
قدیر، وحی، وکریم ،ومہیمن، ومنعام
نکالے ان سے گل و میوہ شاخ و برگ و بار
سب اس کے لطف و کرم کے ہیں عام انعام
نظیر نکتہ سمجھ مہر وفضل خالق کو
اسی کے فضل سے دونوں جہانوں میں ہے آرام[۱۵]

ان اشعار میں نظیرؔ نے اللہ عزوجل کی تعریف بیان کرتے ہوئے اللہ کے اسماء مبارک لکھے اور کہا کہ اس کی ذات ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی ہے۔ وہی طاقت کا مالک ہے، حاکم ہے، رحم و کرم کرنے والا، مصائب و آلام میں حفاظت کرنے والا اور بہت سی نعمتیں عطا کرنے والا ہے۔ وہ اللہ کی ذات ہی ہے جو درختوں اور پودوں کی شاخوں سے پھول اور پھل پیدا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف سے اشرف المخلوقات کے لیے انعام ہیں۔ غزل کا یک شعر ملاحظہ ہو:

اس کے باغ سے دل شاد ہو کے کھاتے ہیں
چھوہارے، کشمش،و انجیرو پستہ و بادام[۱۶]

یعنی ہم چھوہارے، کشمش، بادام، پستہ اور انجیر جیسے میوہ جات اسی کی کرم فرمائی کی بدولت کھا رہے ہیں ،جس طرح سے نظیرؔ نے اپنی نظم میں انجیر کا ذکر کیا ہے۔ انجیر تو جنت کے پھلوں میں سے ایک پھل ہے۔ اس کا ہم جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی غفور ورحیم ہے کہ اس نے ہم جیسے گناہ گاروں کو بھی اپنی رحمتوں سے نوازہ ہوا ہے۔ اس (اللہ تعالیٰ) کی ذات کا نور ہر طرف یعنی سورج، زمین، چاند، ستارے، پہاڑ، سمندر ،دریا، جنگل، صحرا، پھل، درخت اور پودوں میں پھیلا ہوا ہے۔ تو ہم کیوں نہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اس کی اطاعت کریں۔ یوں ہمیں نظیرؔ کی غزل پر سعدیؒ کے جابجا اثرات نظر آتے ہیں جیسے سعدی شیرازی کے حکایت "شکر

گزار بندہ" میں شکر کی تلقین کی گئی ہے۔ ایسے ہی نظیر اکبر آبادی کے غزل میں اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تلقین کی ہے۔

سعدیؒ کی حکایت "روم کا بادشاہ"[17] میں دنیاوی مال وزر پر بات کی کہ بادشاہ بزرگی کی عمر میں پہنچ کر اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں متفکر ہے کہ میرے بعد وہ سلطنت کو کیسے سنبھالے گا اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ بزرگ نے بادشاہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اب تمھاری عمر اپنی فکر کرنے کی ہے۔ تمھارا بیٹا خود کچھ کر لے گا۔ زندگی کا مقصد تخت و تاج سنبھالنا ہی نہیں اور نہ آج تک کوئی انھیں ساتھ لے کر گیا ہے۔ سعدیؒ نے اس حکایت میں یہ باور کرو ایا کہ یہ دنیاوی مال و زر سب یہی چھوٹ جائے گا اور آخرت میں صرف ہمارے اعمال کام آئیں گے۔ اور یہی موضوع ہمیں نظیرؔ کی غزلوں میں نظر آتا ہے مثال ملاحظہ ہو۔

گر عیش سے عشرت میں کٹی رات تو پھر کیا
اور غم میں بسر ہو گئی اوقات تو پھر کیا
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و سب شان
لے شرق تا غرب لگا ہاتھ تو پھر کیا
دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز نظیر آہ
بالفرض ہوئی اس سے ملاقات تو پھر کیا[18]

اس شعر میں نظیرؔ نے دنیاوی مال و متاع کے متعلق کہا کہ یہ کسی کے کام نہیں آئے گا اگر ہمیں دنیاوی مال و زر حاصل ہو بھی جائے تو یہ کوئی ایسا خزانہ نہیں جو بیش قیمتی ہو بلکہ یہ تو آنی جانی شے ہے۔ اس فانی دنیا کے ساتھ فنا ہو جائے گی۔ اس لیے اس کو پا کر انسان کو خوش نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا اصل مقصد و منبع آخرت میں کامیابی حاصل کرنا ہے جو دنیاوی چیزوں سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ سعدیؒ نے اپنی حکایت "روم کا بادشاہ" میں دنیاوی مال وزر کو بیان کیا اور کہا کہ انسان اس کے حصول کی جستجو نہ کرے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی غزل میں بھی سعدی شیرازی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ نظیرؔ بھی دولت کو بڑی شے نہیں مانتے اور ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ اگر مال وزر حاصل ہو بھی جائے تو اس میں کیا بڑی بات ہے؟ اصل کامیابی تو آخرت کے دن پر منحصر ہے ہمیں اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

نظیرؔ کی غزلوں پر سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی اقدار کے اثرات مرتب ہوئے ہیں جس کی ایک واضح مثال اوپر دنیاوی مال وزر کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ ایسے میں سعدیؒ کی حکایت "چیتے پر سواری" میں انھوں نے ایک شخص کی

چیتے پر سواری کا قصہ بیان کیا اور بتایا کہ اسے دیکھ کر میں (سعدی شرازی) کانپنے لگے۔ ایسے میں چیتے پر سوار شخص نے کہا کہ مجھے دیکھ کر حیران مت ہو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت خلوص نیت سے کروگے تو دنیا کی ہر شے تمھاری بھی اطاعت کرے گی۔ شعر ملاحظہ ہو:

جھکا لے جو گردن خدا کے حضورؐ
تو ہو دبدبہ تیرا نزدیک و دور
خدا کو بنا لے اگر اپنا دوست
تو ہوں دوست تیرے دحوش و طیور[19]

اس حکایت میں سعدی شیرازی نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی صدق دل سے اطاعت کروگے تو دنیا میں موجود ہر شے تمھاری اطاعت کرے گی چاہے وہ جتنی طاقت ور شے ہو تمھارا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ عاجزی و انکساری اختیار کرنا ہو گی۔ یہی بات ہمیں نظیرؔ کی غزلوں میں جابجا نظر آتی بس تمھیں اللہ تعالیٰ کے حضور ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہو کیوں نہ تیرے کام میں حیران تماشا
یارب تیری قدرت میں ہے، ہر آن تماشا
لے عرش سے تا فرش نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہے، ہراک شان تماشا
افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات
اور روئے زمیں پہ گل وریحان تماشا[20]

اس شعر میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو پھر پور انداز میں پیش کیا ہے کہ تیری ذات قادر مطلق ہے۔ تیری قدرت پر سب حیران کیوں نہ ہو تو نے اس کائنات میں ایسے ایسے رنگ دکھائے ہیں کی تیری اطاعت کے بغیر کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں فطرت کے ہر مظہر میں دیکھائی دیتی ہیں چاہے وہ زمین ہو یا آسمان، دن ہو یا رات ہو، صحرا ہو یا باغباں اور تارے وغیرہ ان سب میں اللہ تعالیٰ کی جھلک دیکھائی دیتی ہے۔ انسان کی زندگی کا واحد قرینہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت صدق دل سے کرے۔ نظیرؔ کی غزلوں پر ہمیں سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی اقدار کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کا اندازہ اوپر بیان کردہ مثال کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نظیرؔ کی شاعری پر جہاں ایک جانب اطاعت اور دنیاوی مال و زر کے اثرات مرتب ہوئے ہیں وہیں ان کے کلام پر تقویٰ کے اثرات بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ سعدیؒ کی حکایت "بزرگ کی نصیحت" پر نظر ڈالیں تو اس میں ایک حاکم کا قصہ بیان کیا ہے۔ حاکم شیراز اپنا تخت چھوڑنے کا اعلان کرتا ہے اور کہا کہ اب سے وہ خدا کی عبادت کرے گا۔ جس پر بزرگ نے اسے نصیحت کی کہ حکومت میں رہتے ہوئے خلق خدا کی خدمت کرنا اور عدل و انصاف سے کام لینا رہبانیت اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ لہٰذا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے عوام الناس کی خدمت کرو، شعر ملاحظہ ہو:

عبادت ہے دیں خدمت خلق سے
نہ تسبیح و سجادہ دلق سے
خوشی سے تو کر زیب سر اپنا تاج
مگر حسن اخلاق کو دے رواج
بزرگان دیں کا یہی ہے طریق
قبا جسم پر، دل میں گدڑی رفیق[۲۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا انتہائی نیک اور دل سوز عمل ہے مگر اچھے حکمران کو اپنے عہدے پر رہتے ہوئے خدمت خلق کا بیڑا اٹھانا چاہیے۔ اس سے نہ صرف رب کی ذات راضی ہو گی بلکہ عوام کے لیے یہ عمل مسرت بخش ہو گا۔ حاکم وقت کو چاہیے کہ وہ اطاعت الٰہی اور تقویٰ کو اختیار کرتے ہوئے تمام مسائل کو حل کرے۔ اس طرح انسان بہت سے برے اعمال اور برائیوں سے بچا رہتا ہے اور نیکی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ لہٰذا حاکم وقت عوام کے مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت ایماندار اور خلوص نیت سے فیصلے کرنا چاہیے تاکہ عدل و انصاف کا پرچار ہو سکے اور حق دار کو اس کا حق مل سکے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب حکمران اطاعت الٰہی اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہوں، یوں دیکھا جائے تو سعدیؒ کے اثرات نظیرؔ کی شاعری پر نظر آتے ہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تری قدرت کی قدرت، کون پاسکتا ہے کیا قدرت
ترے آگے کوئی قادر کہا سکتا ہے کیا قدرت
تو وہ یکتائے مطلق ہے کہ یکتائی میں اب تری
کوئی شرک و دوئی کا حرف لاسکتا ہے کیا قدرت
زمیں سے آسماں تک تو نے جو جو رنگ رنگے ہیں
یہ رنگ آمیزیاں کوئی دکھا سکتا ہے کیا قدرت

ہماری زندگانی کو بغیر از تری قدرت کے
کوئی پانی کو پانی کر بہا سکتا ہے کیا قدرت[۲۲]

مزید بر آں نظیر کی غزلوں پر سعدیؒ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ایسے میں سعدیؒ کی حکایت "درویش اور ظالم سپاہی"[۲۳] میں بیان کیا ہے کہ کسی ظالم سپاہی نے کسی درویش کو ناحق پتھر مارا۔ درویش چونکہ سپاہی کی طاقت کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے اس لیے وہ پتھر اٹھا کر چلے گئے۔ چند روز بعد بادشاہ سپاہی سے ناراض ہوئے تو اسے قید میں ڈلوا دیا۔ درویش ایک روز اس کنویں کے پاس سے گزرے جہاں وہ سپاہی قید تھا۔ درویش نے وہ پتھر کنویں میں پھینکا ۔ سپاہی نے کہا تم نے مجھے ناحق پتھر کیوں مارا۔ درویش نے جواب دیا میں وہی شخص ہوں جس کو تم نے یہی پتھر مارا تھا۔ یعنی ظالم جب بھی ظلم کرے جلد یا بدیر اس کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملتی ہے۔ بالکل ایسے ہی نظیر اکبر آبادی اپنی غزل میں محبوب کے ظلم کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھ سے ہم کلام نہیں ہوتا اور میرے دل کو اس کے بغیر قرار بھی نہیں ملتا۔ حالاں کہ یہ محبوب کی بے رخی اور سراسر ظلم ہے۔ کہ وہ مجھ کو بے چین کرتا ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر آن تمھارے چھپنے سے ایسا ہی اگر دکھ پائینگے ہم
تو ہار کے اک دن اسکی بھی تدبیر کوئی ٹھہرائینگے ہم
گر کہنا دل نے مان لیا اور رک بیٹھا تو بہتر ہے
اور چین نہ لینے دیویگا تو بھیس بدل کر آئینگے ہم
گر چھپنا بھی کھل جاویگا تو مل کر افسوں سازوں سے
کچھ اور ہی لٹکا سحر بھرا اس وقت بہم پہونچائینگے ہم[۲۴]

ان اشعار میں شاعر نے محبوب کے ظلم کی دہائی دی اور کہا کہ میرا دل اس کو دیکھنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ اس (محبوب) کا چہرہ دیکھے بغیر روح کو چین نہیں ملتا ہے اور محبوب ہے کہ مجھ سے چھپتا رہتا ہے۔ میرا دل اس کی یاد میں مچلتا رہتا ہے۔ محبوب (عشق مجازی) اپنے عاشق پر ہمیشہ ظلم کے پہاڑ ڈھاتا رہتا ہے اور عاشق چپ چاپ اس کے ظلم برداشت کرتا رہتا ہے۔ اگر بات ظلم کی کی جائے تو ظلم چاہے حکمران، غریب عوام پر کرے یا محبوب، عاشق پر دونوں میں ہی تکلیف ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی نے سعدیؒ کی شاعری کی پیروی کی ہے مگر یہاں فرق صرف اتنا ہے کہ سعدی شیرازی نے اپنی حکایت "درویش اور ظالم سپاہی" میں بااختیار شخص کے ظلم کو بیان کیا ہے جبکہ نظیر اکبر آبادی نے محبوب کے ظلم کی بات کی ہے۔ جبکہ دیکھا جائے تو حقیقت یہی ہے کہ محبت میں بھی محبوب با اختیار ہوتا ہے۔ عاشق تو اس کے وصال کے لیے دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔

سعدیؒ کے فکری اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو آپ نے جہاں عجز وانکساری، ظلم، تقوی، اطاعت اور نیکی وغیرہ پر کھل کر بات کی ہے۔ وہیں پر انھوں عدل و انصاف کا پرچار کیا ہے۔ اس کی مثال ہمیں ان (سعدی شیرازی) کی حکایت "انگوٹھی کا نگینہ" میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ جس میں انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکمرانی کا قصہ سنایا کہ ان کے پاس بیش بہا قیمتی نگینہ انگوٹھی میں لگا ہوا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا جب آپ کی رعایا قحط کا شکار ہو گئی۔ انھوں نے اپنی انگوٹھی بیچ دی۔ ان کے خیر خواہوں کو علم ہوا تو انھوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے قیمتی انگوٹھی بیچ ڈالی۔ اس پر عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ یہ بات مجھے گوارہ نہیں کہ رعایا تڑپ رہی ہو اور میں یہ نگینہ پہن کر بیٹھا رہوں۔ شعر ملاحظہ ہو:

جنھیں حق نے بخشا دل درد مند
انھیں اپنا آرام کب ہے پسند
اگر حکمراں سوائے آرام سے
رعایا ہو دو چار آلام سے[۲۵]

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکمران نے عدل وانصاف کا پرچار کیا ہے۔ جب ان کی رعایا مشکل اور بھوک سے دوچار تھی تو انھوں نے ایسے وقت میں دوسرے امراء کی مدد کے بجائے پہلے خود کا مال رعایا کے لیے وقف کر دیا اور یہی ایک اچھے حکمران کی نشانی ہے کہ پہلے وہ انصاف اور مدد خود کرے۔ ایسے دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی کے ہاں بھی عدل و انصاف کا بول بالا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کی تم نے جفا ہم نے وفا جھوٹ ہے یا سچ
سوچو تو اسے دل میں ذرا جھوٹ ہے یا سچ
غصہ بھی کیا دکھ بھی دیے تم نے و لیکن
چپ ہو رہے ہم سر کو جھکا جھوٹ ہے یا سچ
جو تم نے کہا اس کو بجا لانے میں ہم نے
اک لحظہ توقف نہ کیا جھوٹ ہے یا سچ[۲۶]

اس غزل کو ہم دو معنوں میں استعمال کریں گے اول محبوب سے عدل و انصاف کی امید۔ دوم حکمرانوں سے عدل و انصاف کی امید۔ پہلے ہم محبوب سے عدل انصاف کی امید پر بات کریں گے عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اپنے عدل و انصاف سے بتاؤ کہ ہم نے وفا کی، چپ رہے، خفا نہ ہوئے جھوٹ ہے یا سچ۔ عاشق کو محبوب سے اپنی سچی محبت کے لیے عدل و انصاف کی امید ہے۔ اور کہا تم ہم سے خفا ہوئے، جفا کی، دکھ دیئے اور جو کچھ

کہا اسے پورا کرنے کے لیے ایک لمحہ دیر نہ کی۔ اب محبوب کی عدالت میں فیصلہ ہونا ہے اور مجھے عدل و انصاف کی امید ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے مگر وہ چپ ہے۔

غزل کے ان اشعار کو دوسرے معنوں میں لیں یعنی حکمرانوں سے عدل و انصاف کی امید پر بات کریں تو یہاں پر رعایا اپنے حکمران طبقے سے التجا کر رہی ہے اور حاکم سے عدل و انصاف کی اپیل کی ہے کہ تم نے ہم پر ہزاروں ظلم و ستم ڈھائے، وعدہ خلافی کی، دکھ اور درد پہنچایا اور ہم نے بس اسے سہا۔ اب تو عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے بولو کہ یہ جھوٹ ہے یا سچ۔ ہم نے تو بس سہا ہی سہا ہے اپنی وفا کو نبھانے کے لیے تم نے کیا کیا؟ دکھ اور درد کے سوا کیا دیا ہے؟ اس بات کا تم خود عدل و انصاف سے فیصلہ لو کہ جو ہم نے کہا وہ جھوٹ ہے یا سچ۔ ہم نے وعدہ نبھایا اور تم حکمران بن گئے تم نے اپنے وعدے کی پاسداری نہیں کی۔

نظیر اکبر آبادی کی غزلوں میں اخلاقی و سماجی اقدار جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر سادہ، عام فہم اور سماجی و اخلاقی اقدار کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں نظیر کی شاعری پر سعدی شیرازی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ سعدی شیرازی کی حکایات میں جہاں عدل و انصاف، ظلم، تقوی، اطاعت اور نیکی جیسے پہلو نظر آتے ہیں وہاں پر عجز و انکساری کا پہلو نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔ عجز و انکساری کی مثال آپ کی حکایت "ہارون الرشید کا انصاف"[۲۷] میں نظر آتی ہے۔ اس حکایت میں بیان ہوا کہ ہارون الرشید کا بیٹا ایک روز شدید غصے میں ان کے پاس حاضر ہوا آپ نے غصے کا سبب معلوم کیا تو پتہ چلا کسی سپاہی نے اسے گالی دی ہے۔ ہارون الرشید نے اس بات کی تصدیق کی اور چند افراد سے مشورہ لیا۔ کسی نے کہا اسے قتل کر دیا جائے، کسی نے کہا جائیداد ضبط کر لی جائے لیکن ہارون الرشید نے بیٹے سے کہا اسے در گزر کر دو۔ اس حکایت میں ہارون الرشید نے اپنے جاہ و جلال اور رتبے کو خاطر خواہ نہ لاتے ہوئے عجز و انکساری سے کام لیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں بھی ہمیں عاجزی و انکساری نظر آتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو
جدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچے سے
الٰہی راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو[۲۸]

غزل میں نظیر اکبر آبادی نے اپنے محبوب سے جدائی کے غم کو عاجزی سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے جدائی کے غم اور درد کو شاعری کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ کسی کے چاہنے والا اس سے دور نہ

ہو۔ محبوب سے دوری کا دکھ ایسا دکھ ہے جو کسی کو بھی نصیب نہ ہو۔ محبوب سے جدا کرنے والا راہ میں کوئی رقیب نہ ہو۔یوں دیکھا جائے تو سعدی شیر ازی کی حکایت میں ہارون الرشید کی عاجزی وانکساری کو بیان کیا ہے۔ کہ انھوں نے اپنے عہدے اور طاقت کو ملحوظ خاطر نہ لاتے ہوئے در گزر کا فیصلہ کیا ہے۔ جبکہ نظیر اکبر آبادی کی غزلیہ شاعری میں محبوب سے جدائی کے غم میں عاجزی اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ کوئی بھی ایسا رقیب راستے میں نہ آئے جو ہمیں دور کر دے۔ نظیر اکبر آبادی کی عاجزی وانکساری کے متعلق ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا کہیں دنیا میں ہم انسان یا حیوان تھے
خاک تھے کیا تھے غرض اک آن کے مہمان تھے
کر رہے تھے اپنا قبضہ غیر کی املاک پر
غور سے دیکھا تو ہم بھی سخت بے ایمان تھے
اور کی چیز دبا رکھنا بڑی سمجھی تھی عقل
چھین لیں جب اس نے جب جانا کہ ہم نادان تھے[۲۹]

نظیر اکبر آبادی نے غزل کے ان اشعار میں عجز وانکساری کو اختیار کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ ہم اس دنیا میں انسان تھے یا حیوان؟ ہم تو کچھ نہیں یہ جہان فانی ہے اور ہم یہاں کچھ دیر کے مہمان ہیں ہم تو دوسروں کے مال واسباب کو چھین رہے تھے۔ جب خود کو جھنجھوڑا تو علم ہوا کہ ہم بھی دوسرے لوگوں کی طرح بے ایمان ہیں۔ ہم نے غیروں کے مال پر اپنا حق جمانا بڑے عقل کی بات سمجھی۔ در حقیقت اس کے بر عکس یہ سب اس ذات کا ہے۔ جب اس (اللہ تعالیٰ) نے جانا کہ ہم غلط راہ پر ہیں تو اس نے سب کچھ واپس لے لیا۔ مختصر یہ کہ نظیر نے بڑے ہی عجز وانکساری سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے۔ کہ ہم کس چیز اور کس بات پر اکڑتے پھرتے ہیں در حقیقت سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے ۔اس ذات کے آگے ہماری کوئی حیثیت نہیں ۔مزید بر آں اس غزل میں انھوں نے دنیا کی بہت سی خوبصورت رنگینیوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ہمارے پاس دست و پا،زانو، سر،ناک ، آنکھ،کان، نقش و نگار اور دنیا کی تمام آزائشیں موجود تھیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں:

ایک ہی چکر دیا ایسا اجل نے آن کر
جو نہ ہم تھے اور نہ وہ سب عیش کے سامان تھے[۳۰]

سعدی شیر ازی کی دیگر حکایات میں مذہبی، اخلاقی وسماجی اقدار کے بیان میں عدل وانصاف، ظلم، عاجزی و انکساری، تقویٰ، اطاعت اور دنیاوی مال و زر پر بات کی ہے وہیں ان کی حکایات میں صبر و تحمل کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ سعدی شیر ازی کی حکایت "نادان منشی" ملاحظہ ہو۔اس حکایت میں ایک منشی نے اپنی پریشانی کا بیان سعدی

شیر ازی کے حضور عرض کیا اور ان سے دربار میں ملازمت کی سفارش کی۔ آپ نے نصیحت کی کہ وہاں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے اور لومڑی کی کہانی سنائی کہ بادشاہ کے اونٹ بیگار میں پکڑے گئے۔ وہاں پر موجود لومڑی بھاگنے لگی تو کسی نے کہا تم کہا چل دی۔ لومڑی نے جواب دیا یہ نہ ہو کہ مجھے اونٹ کا بچہ سمجھ کر قید کر لیا جائے۔ جب تک جھوٹ سچ کا علم ہو گا میرا کام تمام ہو چکا ہو گا۔ مگر منشی نے ان کی بات نہ سنی۔ شعر ملاحظہ ہو:

ہوش مندوں کی نصیحت پر نہیں دھرتا جو کان
آخر اک دن بیڑیاں ہوتی ہیں اس کے پاؤں میں[۳۱]

تو آپ (سعدی شیر ازی) نے اسے نوکری پر لگوا دیا۔ محنتی ہونے کی وجہ سے اسے جلد ترقی حاصل ہو گئی مگر حاسد اور بد خواہوں نے الزام لگایا اور اسے قید ہو گئی۔ حاجیوں کی واپسی پر قیدیوں کو رہا کیا گیا تو منشی بھی رہا ہو گئے ۔ منشی نے سعدی شیر ازی کو اپنی روداد سنائی اور کہا کہ آپ نے اس وقت بجا فرمایا تھا میں غلطی پر تھا۔ اس حکایت میں سعدی شیر ازی نے منشی کو پریشان کن حالات میں بھی صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کی تھی۔ جس پر عمل نہ کر کے منشی کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ نظیر اکبر آبادی کے ہاں بھی دیگر کئی اخلاقی و سماجی اقدار کی طرح صبر و تحمل کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی جیسے
وہ کمر اور وہ وہاں ، کچھ نہیں اور سب کچھ
بے زری ، فاقہ کشی ، مفلسی ، بے اسبابی
ہم فقیروں کے ہاں بھی کچھ نہیں، اور سب کچھ ہے[۳۲]

نظیر اکبر آبادی نے ان اشعار کے تحت صبر و تحمل کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ کہ ہستیاں نیستیاں یہاں سب کچھ ہے۔ بے زری، فاقہ کشی، مفلسی اور بے اسبابی ہم فقیروں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ باوجود اس کے انھوں نے کہا کہ سب کچھ ہے۔ یعنی انھوں نے مفلسی اور غربت کو بطور آلہ کار استعمال نہیں کیا ہے۔ نہ ہی وہ مظلوم، مفلس، لاچار اور بے بس بنے۔ بلکہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود یہ کہا کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو کسی انسان کے پاس تمام آسائشیں ہوں اور کسی ایک چیز کی کمی ہو جائے تو اس کا مزاج برہم ہو جاتا ہے۔ لیکن نظیر اکبر آبادی نے اپنی غزل میں صبر و تحمل کا درس دیا ہے اور کہا کہ اتنا سب کچھ نہ ہونے کے باوجود ہمارے پاس سب کچھ ہے۔

سعدیؒ کی ایک اور حکایت "بے جا نفرت" میں غرور و تکبر سے نجات کی تلقین کی ہے۔ ایک فقیہہ بازار سے گزرا تو اس نے ایک شرابی کو دیکھا تو اس کی طبیعت میں ناگواری محسوس ہوئی۔ شرابی جو نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا

سمجھ گیا کہ فقیہہ میری حالت دیکھ کر گھن آئی اور ناک چڑھائی۔ تو شرابی بولا ارے فقیہہ اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے دولت اور عزت دی تو اس پر مغرور نہ ہو اگر اللہ تجھے اس حالت میں کرتا تو کیا ہوتا۔ یہ سب دین تو اللہ رب العزت کی ہے جسے چاہے نواز دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ شعر ملاحظہ ہو:

خدا نے تجھ کو بخشی ہے اگر توفیق نیکی کی
تو اس انعام پر مغرور ہو جانا حماقت ہے[۳۳]

یعنی انسان کو اللہ تعالیٰ نے عزت اور دولت سے نوازہ ہے تو وہ اس پر مغرور نہ ہو اور نہ ہی دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھے۔ سعدی شیرازی کی ایک اور حکایت "دنیا پرست عابد" میں ریاکاری کو موضوع بحث لایا گیا ہے۔ ایک شخص کے متعلق یہ بات مشہور ہو گئی کہ وہ عبادت گزار ہے اور وہ حقیقتاً عبادت کرتا تھا۔ محض لوگوں کو فریب اور دکھاوے کے واسطے۔ یہ خبر بادشاہ کو ملی تو انھوں نے اس سے ملنے کے لیے پیغام رساں بھیجا۔ یہ شخص اندر ہی اندر خوش ہوا اور انعام کے چکر میں سوچا کوئی ایسی دوا لے لوں جس سے مزید میں کمزور دکھوں اس نے کمزوری والی دوا زیادہ انعام کے چکر میں پی لی۔ دراصل یہ دوا کمزوری کے بجائے زہر تھا جو وہ پیتے ہی مر گیا۔ شعر ملاحظہ ہو:

خدا کو چھوڑ کے مخلوق کی رضا چاہی
خدا کا گھر نہیں پیش نظر تھی دنیا ہی[۳۴]

اس طرح ہم نظیر اکبر آبادی کی غزلیہ شاعری میں بھی سعدیؒ کی حکایت "بے جا نفرت" میں زیر بحث موضوع غرور و تکبر تھا جبکہ دوسری حکایت "دنیا پرست عابد" میں زیر بحث موضوع ریاکاری تھا۔ ان دونوں حکایتوں کے اثرات نظیرؔ کی غزل پر جابجا نظر آتے ہیں۔ غرور و تکبر کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک دن اس مہر خوبی کے حضور
بیٹھ کر ہم نے کہا اے رشک و حور
ہم کریں عجز و نیاز و انکسار
تم کرو جور و جفا ناز و غرور[۳۵]

ان اشعار میں نظیر اکبر آبادی نے محبوب سے کہا ہے کہ ہم عاجزی و انکساری کو اختیار کریں اور تم غرور و تکبر کرو۔ یہ بات ناانصافی کی ہے۔ ہمیں بتاؤ ہماری کیا غلطی ہے۔ ایسے ہی ریاکاری یعنی فریب اور دھوکے بازی کے حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

شمع نے بھی کب کہا پروانے کو

یہ کہ تو جل مجھ پہ ہو کر ناصبور
بلبل و پروانہ جب آپ ہی کریں
اس میں گل و شمع کا پھر کیا قصور[۳۶]

نظیر اکبر آبادی نے غزل کے ان اشعار میں محبوب کے فریب اور ریاکاری پر بات کی ہے کہ محبوب نے تو نہیں کہا کہ پروانہ اس پر گر کر جلے۔ اس میں گل اور شمع کا کیا قصور ہے۔ در حقیقت تو گل اور شمع کا ہی مسئلہ ہے وہ چاہتا ہے کہ اس پر پروانہ گرے۔ مختصر یہ کہ نظیرؔ نے اپنی اس غزل میں غرور و تکبر اور ریاکاری کہ نشاندہی کی۔ محبوب بظاہر یہ ہی کہتا نظر آئے گا کہ پروانے کا مجھ پر گرنا میری غلطی نہیں جبکہ اصل میں وہ چاہتا ہے کہ اس کا کوئی خیال رکھنے والا اور اس پر مر مٹنے والا کوئی ہو۔ مگر وہ اس احساس کو ظاہر نہیں کرتا۔ محبوب مغرور بھی ہے اور ریاکار بھی۔ یہی صورت ہمیں سعدی شیرازی کی حکایتوں میں نظر آتی ہے۔ سعدی شیرازی نے انسان کو مغرور اور ریاکار بننے سے منع کیا ہے۔ جبکہ نظیر اکبر آبادی نے محبوب کے ضمن میں اس کو بیان کیا ہے۔ کہ وہ مغرور بھی ہے اور ریاکار یعنی فریبی بھی ہے۔ نظیرؔ کی غزلوں میں جہاں سماجی و اخلاقی رجحان پایا جاتا ہے وہیں ان کی غزلیات میں مذہبی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ان کی دو مختلف غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نور حق شافع امت سے کہو عشق اللہ
ہر دم اس شاہ ولایت سے کہو عشق اللہ[۳۷]
تیری وہ شان کی رفعت ہے یا رسول اللہ
کہ لامکاں نے کہا "لا الہ الا اللہ"[۳۸]

المختصر اس باب میں "نظیر اکبر آبادی کی غزلوں پر شیخ سعدی کے مذہبی، اخلاقی و سماجی اثرات" کا بیان موجود ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی غزلوں کو سعدیؒ کی اخلاقی و سماجی حکایتوں کی روشنی میں ان اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنی تحریروں میں عامیانہ روش کو اختیار کیا ہے۔ اس کی بدولت ان کی شاعری خواص کے بجائے عوام میں مقبول و پسند کی جاتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو نظیر کی شاعری نے خاص و عام کو متاثر کیا ہے۔ مگر عوام الناس میں انھیں زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ عزیز احمد اپنے مضمون "نظیر کی غزل گوئی" میں لکھتے ہیں:

> نظیر کی شاعری چونکہ عوام الناس کے لیے تھی اس لیے نظیر نے ان کے الفاظ میں بے تکلفی سے برتے ہیں اور اسی لیے غزل کے مضمون میں بھی انھوں نے آزاد روی کی روش کو دھڑلے سے انتخاب کیا ہے۔[۳۹]

اس باب میں نظیر اکبر آبادی کی غزل نگاری پر شیخ سعدی شیر ازی کے مذہبی، اخلاقی و سماجی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا کہ نظیر اکبر آبادی نظم نگاری تک محدود نہیں رہے بلکہ غزل کے میدان میں بھی انھوں نے کافی کام کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم (لاہور، زین نعمان پرنٹرز، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۲۲۔

۲۔ ممتاز الحق، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۱۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۴۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف (لاہور: اسلوب، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۴۶۔

۵۔ نظیر اکبر آبادی، نظیر اکبر آبادی کی منتخب شاعری مرتبہ ابن کنول (انڈیا: نیشنل بک ٹرسٹ، ۲۰۱۳ء)، ص۔ ۷، ۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۷۔

۷۔ غلام آسی رشید، اردو غزل کا تاریخی ارتقا (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۶ء)۔ ص ۱۳۔

۸۔ ابو اللیث صدیقی، "نظیر کی غزلیں" مشمولہ نظیر فہمی (۱۸۰۶ء تا ۲۱۰۴ء) جلد دوم مرتبہ شمس الحق عثمانی (دہلی: دہلی کتاب گھر، ۲۰۱۶ء)، ص ۶۲۱۔

۹۔ عزیز احمد، "نظیر کی غزل گوئی" مشمولہ نظیر فہمی (۱۸۰۶ء تا ۲۱۰۴ء) جلد دوم مرتبہ شمس الحق عثمانی (دہلی: دہلی کتاب گھر، ۲۰۱۶ء)، ص ۶۱۰۔

۱۰۔ عبد الباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی (لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۹۵۱ء)۔ ص ۸۱۔

۱۱۔ نظر زیدی، حکایات گلستا ن سعدی (لاہو: فیروز سنز، س۔ن۔)، ص ۲۹۔

۱۲۔ عبد الباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۱۴۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲۔۱۴۳۔

۱۴۔ نظر زیدی، حکایات گلستا ن سعدی، ص ۱۰۶۔

۱۵۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۱۱۱۔

۱۶۔ایضاً،ص۱۱۱۔

۱۷۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی(لاہور:فیروز سنز،س۔ن۔)،ص۲۰۔

۱۸۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۵۔۶۔

۱۹۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی،ص۱۱۔

۲۰۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۳۔

۲۱۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی،ص۱۸۔

۲۲۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی ،ص۸۵۱۔

۲۳۔نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی(لاہور:فیروز سنز،س۔ن۔)،ص۴۳۔

۲۴۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۱۰۸۔

۲۵۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی،ص۱۶۔

۲۶۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۴۷۔

۲۷۔نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی،ص۶۰۔

۲۸۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۱۲۹۔

۲۹۔ایضاً،ص۱۶۳۔

۳۰۔ ایضاً،ص۱۶۳۔

۳۱۔نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی،ص۳۶۔

۳۲۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۱۸۶۔

۳۳۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی،ص۱۴۹۔

۳۴۔ نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی،ص۸۰۔

۳۵۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۸۱۔

۳۶۔ایضاً،ص۸۱۔

۳۷۔ایضاً،ص۱۳۵۔

۳۸۔ایضاً،ص۱۳۷۔

۳۹۔عزیز احمد،"نظیر کی غزل گوئی"مشمولہ نظیر فہمی(۱۸۰۶ء تا۲۱۰۴ء)جلد دوم مرتبہ شمس الحق عثمانی ،ص۶۱۴۔

باب چہارم:

نظیر اکبر آبادی کی منظومات میں محاکات اور منظر کشی کا تجزیہ

نظم نگاری اردو ادب کی اہم ترین صنف سخن ہے۔ نظم عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی "لڑی، سلک، موتیوں کو دھاگے میں پرونا"[1] وغیرہ کے ہیں۔ انگریزی میں نظم کو poem کہتے ہیں۔ نظم نگاری سے مراد کسی ایک موضوع پر مسلسل اظہار خیال کے ہیں۔ عام لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم نگاری انسان کے شعوری اور لاشعوری جذبات اور خیالات کے مسلسل اظہار بیان کا نام ہے۔ شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات، مصائب و آلام اور مشکلات سے دو چار ہوتا ہے وہ ان تجربات، تخیلات، احساسات اور ذہنی اثرات و جذبات کو خوبصورت انداز میں نظم کر دیتا ہے یوں دیکھا جائے تو نظم نگاری کی کوئی باقاعدہ تعریف نہیں ملتی لیکن آکسفورڈ ڈکشنری میں نظم کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

> A piece of writing in which the expression of feelings and ideas is given intensity by particular attention to diction (sometime involving rhyme), rhythm and imagery.[2]

مرثیے، مثنوی، قصیدہ، ہجو، مخمس اور مسدس وغیرہ نظم نگاری کے ذیل میں آتی ہیں گو کہ یہ اصناف اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہیں باوجود اس کے یہ نظم میں شمار کی جاتی ہیں۔ نظم نگاری کی دو اقسام ہیں اوّل پابند نظم، اس میں قافیہ، ردیف اور بحر کی پابندی کی جاتی ہے۔ دوم آزاد نظم، اس میں قافیہ اور ردیف کی کوئی خاص پابندی نہیں کی جاتی ہے اس لیے اس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ابتدائی طور پر شاعری میں غزل کے اثرات نمایاں تھے۔ جنگ عظیم کے بعد معاشی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مسائل نے شعراء کو نظم کی جانب متوجہ کیا گو کہ جنگ عظیم سے قبل بھی نظم لکھی جاتی تھی۔ لیکن اس صورتحال کے بعد آہستہ آہستہ نظم کا رجحان بھی عام ہونے لگا۔ یوں دیکھا جائے تو نظم کو مضبوط و مستحکم کرنے میں نظیر اکبر آبادی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ بعد ازاں بہت سے شعراء نے اپنے قلم کا رخ اس جانب موڑا اور اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان میں ایک اہم ترین نام نظیرؔ کا ہے۔ ان کے متعلق بعض مصنفین کا یہ خیال ہے کہ نظیرؔ کی شہرت و مقبولیت نظم نگاری کی بدولت ہے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں: "وہ (نظیر) اپنی نظموں کی بل پر زندہ رہے اور زندہ رہیں گے۔"[3] یہ بات نہ صرف انھوں نے کہی بلکہ بہت سے مصنفین اور ناقدین نے یہی کہا کہ نظیرؔ کی شہرت و مقبولیت نظم کی وجہ سے ہے۔ ان (نظیر) کی غزلوں کی نسبت نظموں کو زیادہ داد و تحسین ملی۔ ڈاکٹر علیم، طلعت حسین نقوی کی تصنیف نظیر

اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ میں نظیر کی غزلوں و نظموں میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ابتدائی نظموں، غزلوں اور قصّوں میں متوسط طبقے کے تصورات کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور عوامی زندگی ان دونوں پردوں کی اوٹ سے کبھی کبھی جھانک لیتی ہے، جیسے نظیر اکبر۔ آبادی کے کلام میں، جن کی غزلیں بالکل روایتی انداز کی ہیں مگر نظموں میں عوام کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔[۴]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں واضح فرق موجود ہے۔ نظیرؔ کی غزل روایتی رنگ سے لبریز ہے جبکہ ان کی منظومات میں عوامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ نظیرؔ کا یہی وہ انفرادی انداز بیان ہے جو ان کو باقی شعراء سے ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ نظیرؔ کی منظومات ہی ان کی وجہ شہرت بنی۔ ان کی منظومات میں پیش کردہ موضوعات نے ان کی شاعری کو آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر ایک پہلو کو اپنا موضوع بنا کر اس پر قلم آزمائی کی اور وہ اس میں جس قدر کامیاب ہوئے شاید ہی کوئی شاعر ایسا کارنامہ سرانجام دے سکے۔ موضوعات کی جو رنگی اور شوخی انھوں نے پیش کی ایسی مثالیں ہمیں اردو ادب میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے موضوعات میں میلوں ٹھیلوں، تہوار، کھیل تماشے اور فطرت نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے موضوعات میں بنجارانامہ، شب برات، شہر آشوب، آگرے کی تیراکی، کبوتر بازی، نظیر روضہ سلیم چشتی، چڑیوں کی تسبیح، آدمی نامہ، کورا برتن، تن کا جھونپڑا، آٹے دال کی فلاسفی، گرونانک شاہ، تاج گنج کا روضہ، عید الفطر، ہولی، بسنت، راکھی، برسات کی بہاریں، گلہری کا بچہ وغیرہ جیسی انھوں نے لاتعداد منظومات کہیں۔ ان کی منظومات میں مذہبی تفریق نہیں ملتی ہے۔ چاہے وہ مسلمانوں کی مذہبی رسومات ہوں یا ہندوؤں کے تہوار، نظیرؔ نے اپنے گردو نواع میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو اپنی تحریر کے ذریعے قلم بند کر دیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی ہندوستانی شاعر تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں ہندوستانی رنگ غالب ہے۔ اس کے متعلق مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

> نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کی رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں وہ اپنی گردو پیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی مونست رکھتے ہیں اور انھیں سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے نظیرؔ ہیں۔ نظیرؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات اور عام معاشرت اور یہاں کے رسوم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔[۵]

چوں کہ نظیر عوام پسند شاعر تھے اس لیے ان کی منظومات عوامی رنگ میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے رسم ورواج کو جیسے انھوں نے پیش کیا ہے اور جس طرح کے موضوعات کو انھوں نے برتا کوئی شاعر ان کو موضوع تحریر نہیں لا سکا۔ اس کے متعلق وحید الدین سلیم نے لکھا ہے کہ "نظیر اکبر آبادی نے عام لوگوں کے میلوں، ٹھیلوں اور ان کے حالات وخیالات اور مشاغل کی ایسی سچی اور صحیح تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس کا مقابلہ اس باب میں نہیں کر سکتا۔"[۱] نظیر اکبر آبادی کا عہد سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے زبوں حالی کا شکار تھا۔ انھوں اس عہد کی مشکلات و مصائب کو زیر غور رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں عوامی رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ نظیرؔ خود پسند انسان نہیں تھے بلکہ وہ انسان دوست، ہمدرد اور لوگوں کا دکھ، درد سمجھنے والے شخص تھے۔ انھوں نے اپنے زور قلم کے تحت اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات و واقعات کو اپنی منظومات کے ذریعے ہر فرد تک پہنچایا ہے۔ خاص طور پر انھوں نے اپنی منظومات کے ذریعے حکمران طبقے کو جھنجھوڑنے کے لیے عوام کے مسائل اور مشکلات کو ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی حساسیت اور نزاکت کے پیش نظر نظیرؔ نے عوامی رنگ اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری خواص سے زیادہ عوام میں مقبول ہے۔ انھوں نے گرد و پیش کے حالات و واقعات کو اپنی منظومات میں قلمبند کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے نظیرؔ کی عوام پسندی شاعری کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

> نظیر نے ہر جگہ عوامی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ایسے عوامی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جن سے عوامی زندگی عبارت۔ ان کی خوشیاں ان کے رنج و غم، ان کے جذبات، ان پر بیتی ہوئی کیفیات، ان کے تیوہار، ان کے آئے دن کی دلچسپیاں، ان کے خیالات و نظریات، اعتقادات و توہمات سب کے سب نظیر کی شاعری میں بے نقاب ملتے ہیں۔ نظیرؔ اس اعتبار سے بہت بڑا شاعر ہے۔[۲]

نظیر اکبر آبادی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنی منظومات میں میلوں ٹھیلوں، تہوار، تقریبات، رسم و رواج اور عقائد و روایات کو موضوع بحث لایا ہے۔ اب ہم نظیرؔ اور شیخ سعدی کی منظومات میں محاکات اور منظر کشی کا مطالعہ کریں گے۔

محاکہ (حکائی بیان) کی جمع محاکات ہے۔ محاکات ایک شعری اصطلاح ہے۔ اس سے مراد کسی واقعہ یا قصہ کا اس طرح بیان کرنا کہ اس شے کا تصور ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اس اصطلاح کو اردو میں شبلی نعمانی نے روشناس کرایا ہے۔ جو کہ مغربی مفکر ارسطو کے نظریہ mimesis کے مماثل نظر آتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اس نظریے کے متعلق یہ رائے دیتے نظر آئے ہیں کہ:

ابن رشد اور دیگر عربوں نے Mimesis کا ترجمہ "محاکات" کیا، لیکن اردو میں "محاکات" کسی اور معنی میں مستعمل ہوا۔ شبلی نے البتہ جگہ جگہ "محاکات" سے ایک قسم کی mimesis ہی مراد لی ہے۔ ابن رشد نے "محاکات" سے پیکر سازی اور اعمال و کردار کو پیش کرنے کا عمل مراد لیا۔[8]

شبلی نعمانی محاکات کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: "محاکات کے معنی کسی چیز، کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔"[9] جہاں شاعر اپنے شعری کلام میں مصوّری، فطرت نگاری، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہیں پر کچھ شعراء محاکات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ شاعر عمیق مشاہدے اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات سے بھی آراستہ ہو۔ محاکات یعنی شاعر کسی بھی واقعہ کی تصویر اس طرح پیش کرے کہ وہ عکس ہمیں مجسم صورت میں نظر آئے۔ یعنی کسی شے کی تصویر کو اس طرح ابھارنا کہ اس کا تصوّر ہمارے روبرو آجائے۔ تو اسے محاکات کہتے ہیں۔ توقیر احمد نے محاکات کے بارے میں لکھا ہے کہ: "یہ شاعری میں روح پھونکنے والی چیز ہے اور بے جان اور مردہ اشیاء میں ارتعاش پیدا کرنا اسی کا کمال ہے۔"[10] شبلی اور توقیر احمد کے علاوہ ریختہ ڈکشنری میں محاکات کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے کہ:

> کسی قول یا فعل کی نقل کرنا، آپس میں بات چیت کرنا، شاعری میں واقعات کی صورت گری ،تصویر کشی، منظر کشی" وغیرہ کے ہیں۔[11]

شبلی کے نزدیک مصوّری اور شاعرانہ مصوّری (محاکات) میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ مصوّر کو کسی بھی چیز یا حالت کے اظہار بیان کے لیے اس کے جذبات و احساسات اور مادی شے کے تمام خط و خال کا خیال رکھنا پڑھتا ہے۔ مصوّر تصویر کشی کے دوران اس شے کے ایک ایک پہلو کو بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مصوّر تصویر کے کچھ پہلو مبہم رکھتا ہے۔ لیکن وہ مصوّری اس دلچسپی سے کرتا ہے کہ تصویر کے پوشیدہ پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ جبکہ محاکات میں شاعر کو زیادہ عرق ریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ شاعر کسی بھی موضوع کے چند ایک پہلو کو زیر بحث لاتے ہوئے اس طریقے سے پیش کرتا ہے کہ وہ شے ہمارے سامنے مجسم ہو جاتی ہے۔ شبلی محاکات اور مصوّری میں پائے جانے والے فرق کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیاء کے علاوہ، حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جاسکتی ہے، چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصور، انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج، تفکر، حیرت، استعجاب، پریشانی اور بے تابی ظاہر ہو، جہانگیر کے

سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی، جس کے تلوے سہلائے جارہے ہیں، تلووں کے سہلاتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا، تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔[12]

محاکات اور منظر کشی میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ محاکات یعنی مختلف تصورات کا اظہار بیان ہے۔ اس میں شاعر کسی بھی جذبے، واقعہ اور حالات وواقعات کو اس مہارت اور جنبش سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ اور صورتحال کا تصوّر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ جبکہ منظر کشی میں دیگر مناظر فطرت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ سلام سندیلوی کہتے ہیں کہ: "منظر نگاری اس شاعری کو کہہ سکتے ہیں جس میں کسی منظر کی عکاسی کی گئی ہو۔ مگر خاص طور سے منظر نگاری کا اطلاق اس شاعری پر ہوتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔"[13] یعنی الفاظ کی مدد سے مناظر کو پیش کرنا۔ محاکات شاعری میں محاسن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو تحریر کو نہ صرف پر لطف اور پر مغز بناتے ہیں۔ بلکہ محاکات کے خوبصورت اظہار بیان سے قاری کی دلچسپی اور لگاؤ بھی اضافہ ہوتا ہے۔ شاعر کسی بھی جذبے، کیفیت، حسن و جمال، فطرت نگاری، جنگ و جدل، لڑائی، موسم اور معرکہ وغیرہ جیسے موضوعات پر اس خوبصورتی اور تراش خراش سے اظہار خیال کرتا ہے کہ اس کی واضح تصویر یا نقش ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

محاکات اور تخیل کے متعلق شبلی نعمانی محاکات کی تعریف، محاکات کی تکمیل کے ذرائع، دقیق محاکات کی خصوصیت، محاکات میں مخالف پہلو دکھانا، تشبیہ کے ذریعے محاکات کا بیان اور مبہم محاکات وغیرہ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تخیل اور محاکات پر بھی مفصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگرچہ محاکات اور تخیل دونوں شعر کے عناصر ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے، محاکات میں جو جان آتی ہے، تخیل ہی سے آتی ہے، ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں۔[14]

شبلی کے علاوہ عبدالرحمن نے بھی تخیل و محاکات، توجیہ و تاویل، محاکات و تخیل کی عام مشہور اصطلاح اور محاکات و تخیل میں منافات نہیں کے عنوان پر تفصیلاً بحث کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

میرے نزدیک جذبات ہوں یا خیالات، افکار ہوں یا تخیلات، بغیر محاکات کے گونگے کے خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کیونکہ محاکات کی حقیقت ہے نقل ہو بہو یا ادائے خیال کما ہو جس کو برابر تصویر معنی کہتا چلا آرہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر میرا وہمیا فہم صحیح ہے تو تخیل محاکات سے اور محاکات تخیل سے بے نیاز نہیں۔[15]

ریاض احمد اپنی تصنیف میں شبلی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

شبلی نے محاکات اور تخیل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے مجموعی مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام خصوصیات کو جو الفاظ اور طریق اظہار سے متعلق ہیں۔ شبلی نے محاکات کے تحت رکھا ہے اور معنوی خصوصیات کو تخیل سے منسوب کیا ہے۔[16]

ان تمام تعریفوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ محاکات اور تخیل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ شاعر محاکات کے اظہار خیال کے لیے جزئیات نگاری سے بھی کام لیتا ہے۔ جو ان کی تحریر کو خوبصورت اور دلفریب بنا دیتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اردو ادب میں بہت سے شعراء نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہمارا اصل مقصود نظیرؔ کی منظومات میں محاکات اور منظر کشی کا مطالعہ کرنا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نظیرؔ کی منظومات میں منظر کشی اور محاکات کی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اپنی منظومات میں جہاں عوامی مسائل کو موضوع سخن لائے وہیں ان کے شعری کلام میں خوبصورت جزئیات کے ساتھ ساتھ محاکات اور منظر کشی کی بھی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ان منظومات میں برسات اور پھسلن، جاڑے کی بہاریں، برسات کی اومس، تل کے لڈو، آدمی نامہ اور مفلسی شامل ہیں۔ ان منظومات میں نظیرؔ نے برسات، آدمی، مفلسی اور تل کے لڈو کی تصویر دلکش انداز میں پیش کی ہے۔ نظم "برسات اور پھسلن" میں برسات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ نظیرؔ نے برسات کے موسم کے حالات کا تذکرہ اس خوش اسلوبی سے کھینچا کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں وہی منظر نظر آنے لگتا ہے۔ یعنی نظیرؔ نے بارش میں ہونے والے نقصان کی تصویر کشی کی ہے۔ نظیرؔ نے کہا کہ برسات کے موسم میں کسی کا گھر گر جاتا ہے، کسی کی منڈیر، کسی کا دروازہ، کسی کا چھت گر جاتا ہے تو کسی کے گھر پانی ٹپکنے لگتا ہے۔ یہاں مفلس، غریب ہی نہیں بلکہ پالکی میں بیٹھے بھی پھسل رہے ہیں کوئی کیچڑ میں پھنسا ہے، اور کوئی اس میں گرا ہے، سمجھدار اور ناچار سبھی چکنی مٹی پر پھسل گئے۔ اس نظم کا بند ملاحظہ ہو:

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا
کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا
اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ کر
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا[17]

نظیرؔ کی یہ نظم منظر کشی کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے جیسے اوپر بیان کیا گیا کہ مناظر قدرت کو ہی منظر کشی کہا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی نظیرؔ نے "برسات اور پھسلن" میں مناظر کو اس محنت اور لگن سے پیش کیا ہے کہ ہمیں ایسے معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ہم وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ نظیرؔ نے اس نظم میں انسان کی بے بسی اور

لاچاری کو بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا حکم دیتے ہیں۔ تو اس کے آگے کوئی کچھ نہیں کر سکتا چوں کہ نظیرؔ نے اپنے موضوعات میں انسان کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے "برسات اور پھسلن" میں منظر کشی کرتے ہوئے لوگوں کی مشکلات کو قلمبند کیا۔ برسات کے ماحول میں لوگوں کو در پیش دشواریوں کو اس حسن اور رنگینی سے پیش کیا ہے کہ اس کو مناظر قدرت کی واضح مثال کہہ سکتے ہیں۔ نظیرؔ کی ایک اور نظم "برسات کی اومس" بھی منظر کشی کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کا بند ملاحظہ ہو:

کیا ابر کی گرمی میں گھڑی پہر ہے اومس
گرمی کے بڑھانے کی عجب لہر ہے اومس
پانی سے پسینوں کی بڑی نہر ہے اومس
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر شہر میں اومس
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس[۱۸]

اس بند میں نظیرؔ نے اومس یعنی برسات کے موسم میں حبس، گرمی کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ ہر طرف چاہے باغ ہو، دریا ہو یا شہر ہر جگہ اومس کی رت چھائی ہے۔ نظیرؔ برسات کے موسم کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اس موسم میں گرمی لگتی ہے تو ہمیں گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ اس موسم میں جب بادل چھا جاتے ہیں اور ہوا بند ہو جاتی ہے۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سانس رک جائے گی۔ جب پسینہ آتا ہے تو وہ جسم کو کاٹنے لگتا ہے ادھر مکھیاں بھی بھنبھناتی ہیں۔ صاحبوں نہ پوچھو جو گرمی سے برا حال ہوتا ہے۔ نیز نظیرؔ نے کہا کہ جب ہوا رک جاتی ہے تو گرمی سے ایک سانس آتا ہے تو ایک سانس جاتا ہے۔ رات کا احوال کچھ اس طرح بیان کیا کہ گرمی کی ایک رات قیامت کی ہوتی ہے۔ رات کو پسو اور مچھر ناچ ناچائیں، چادر اوڑیں تو پسینہ آئے جو نہ اوڑیں تو کھٹمل اور مچھر کاٹ کھائیں۔ نظیرؔ نے اس نظم میں برسات کے موسم میں حبس کی تصویر کا منفرد اور خوب صورت نمونہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ ان کی نظم "آدمی نامہ" میں محاکات کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس نظم کا بند ملاحظہ ہو:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بینوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی[۱۹]

نظیرؔ نے اس بند میں آدمی کی تصویر اس طرح پیش کی ہے کہ ہر آدمی چاہے وہ بادشاہ ہے، مفلس ہے، زردار ہے، نعمت کھانے والا، ٹکڑے مانگنے والا، مسجد بنانے والا، خطبہ دینے والا امام، قرآن پڑھنے والا، نمازی، جوتیاں چرانے والا اور جو ان کو تاڑتا ہے سو وہ بھی آدمی ہی ہے۔ اس نظم میں انسان دوستی، ہمدردی، مساوات کا درس دیا گیا۔ ان باتوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کو بیان کیا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ امیر و غریب، اعلیٰ و ادنیٰ، مفلس، بد، نیک، سرمایہ دار، فقیر، مومن، ابدال، غوث، ولی، منکر، کرشمے، کشف و کرامات، نور، نار، فرعون، نمرود، شداد خدائی کا دعویٰ کرنے والے بھی آدمی ہی ہیں۔ یہاں شیطان، ہادی و رہنما، قاضی و وکیل، شادی بیاہ، گلے میں پھانسی ڈالنے والا، جھوٹا، سچا سب کے سب چیزوں کا محور آدمی ہی ہے۔ یعنی نظیرؔ نے اس نظم میں محاکات کا خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ طلعت حسین نقوی نظم "آدمی نامہ" کے بارے میں کہتے ہیں۔ "نظم "آدمی نامہ" میں نظیرؔ نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ انسان انسان سب برابر ہیں رنگ و نسل، مذہب و ملت اور اعلیٰ و ادنیٰ کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان آپس میں فرق پیدا کرنا انسانیت کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر ہر شخص آدمی ہونے کے ناتے، مساوی حقوق کا مستحق ہے۔[20] اس اقتباس پر روشنی ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ نظیرؔ نے اس نظم کے ذریعے انسانوں کے درمیان موجود تعصبات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسجد بنانے والا، خطیب، نمازی، قرآن، جوتیاں چرانے والا اور اس کو دیکھنے والے سب آدمی ہی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی[21]

نظیرؔ نے اس نظم میں حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ سب کچھ کرنے والا آدمی ہی ہے۔ اس نظم میں عدل و انصاف کا درس دیا گیا ہے۔ تمام اشرف المخلوقات چاہے امیر ہے یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر، نیک ہو یا بد وہ آدمی ہے۔ نظیرؔ نے "آدمی نامہ" میں محاکات کا دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ نیز اس نظم میں انسانی ہمدردی، مساوات، عدل و انصاف، بھائی چارہ اور اتحاد کو فروغ دیا ہے۔ کسی بھی شخص کو اپنی رنگ و نسل اور امیری کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسروں کو کمزور اور ناکارہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر اس کے پاس اچھا پہننے اور اوڑھنے کو کچھ نہیں تو اس کا مذاق اڑانے کے بجائے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ چاہے جو بھی ہو نیک، بد، گنہگار، امیر اور غریب سب آدمی ہی

ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اختیار کرنی چاہیے اور ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنا چاہیے۔ نظم کے چند آخری اشعار ملاحظہ ہوں:

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی[۲۲]

یہی اثرات ہمیں نظیرؔ کی ایک اور نظم "مفلسی" میں بھی نظر آتے ہیں یعنی "آدمی نامہ" کی طرح "مفلسی" میں بھی محاکات سے کام لیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ نظم بیانیہ ہے اور طویل بھی ہے اس لیے اس کو مکمل طور پر لکھا نہیں جا سکتا اس لیے نظم "مفلسی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیا سا تمام روز بیٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی[۲۳]

ان اشعار میں نظیرؔ نے کہا کہ جب کسی بھی شخص پر مفلسی آتی ہے تو وہ اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ کوئی شخص ان کی عزت نہیں کرتا ہے۔ غربت جس نے دیکھی ہو وہ ہی اس قرب کو محسوس کر سکتا ہے۔ مفلسی انسان کو طرح طرح کی مشکلات سے دوچار کرتی ہے۔ مفلس انسان اس انتظار میں شب و روز بھوک میں گزار دیتا ہے کہ اسے کچھ کھانے کو مل جائے۔ غریب شخص کی نہ کوئی خوشی ہوتی ہے نہ ہی کوئی غم میں پوچھنے والا ہوتا ہے۔ محمد افضل حمید اور ذوالفقار علی اپنے مقالے "نظیر اکبر آبادی اور فلسفہ زر" میں نظم "مفلسی" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "مفلسی کی فلاسفی" نظیر کی لافانی نظموں میں سے ایک ہے۔ نظیر نے اس نظم میں افلاس کے اثرات کو ظریفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مختلف پیشہ وروں اور عالموں کے علاوہ عام آدمیوں پر مفلسی آتی ہے تو معاشرے میں ان کے ساتھ مضحکہ خیز سلوک روا رکھا جاتا ہے۔[۲۴]

مفلسی انسان کو کسی طور آزاد نہیں رہنے دیتی ہے۔ اس کی زندگی زنجیروں میں جکڑی رہتی ہے وہ ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانا چاہے بھی تو نہیں پا سکتا ہے۔ ایسے شخص کو نہ ہی معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور نہ ہی اسے گھر سے عزت ملتی ہے۔ نظیرؔ کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھانتا نہیں
مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں
صورت بھی اس کی پھر کوئی پہنچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی [۲۵]

مفلسی ایسی شے ہے کہ غریبوں کے دکھ درد، تکالیف اور پریشانیوں کا کوئی مداوا کرنے والا نہیں، غریبی انسان کی ذات اور حسب نسب تک کو بھلا دیتی ہے اور دوسرے لوگ اس کی ذات تک کو نہیں پہچانتے ہیں۔ نظیرؔ نے یہاں پر محاکات کا استعمال کیا ہے۔ مزید یہ کہا کہ مفلسی حکیم کی حکمت، عالم فاضل کا علم اور یہاں تک کہ اس سے شرم و حیا تک چھین لیتی ہے۔ غریب شخص کا کوئی پرسان حال نہیں اور امیروں کی سب واہ واہ کرتے ہیں۔ مال دار شخص کی سب عزت و تکریم کرتے ہیں۔ نظیرؔ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا جو کہ ایک حقیقت ہے کہ مفلسی جس گھر کا رخ کرتی ہے پھر اس گھر سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ زندگی جینے کے لیے خوراک بہت ہی ضروری شے ہے جب مفلس کو کھانا ہی نہیں ملتا تو اس کے نزدیک حلال و حرام میں تمیز نہیں رہتی ہیں۔ انھیں جیسا بھی جہاں سے ملے وہ کھا لیتے ہیں اول تو ان کو کچھ کھانے کو نصیب نہیں ہوتا اگر مل بھی جائے تو اسے ایک دوسرے سے کھینچ کر کھانا پڑتا ہے۔ نظم "مفلسی" کے آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے ایک آن میں فقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیرؔ
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی [۲۶]

نظیرؔ نے اس نظم میں جس طرح محاکات کو برتا ہے۔ اس سے غربت اور مفلسی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ نظم "مفلسی" میں اہل حکمران کو اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی کہ حاکم وقت کا یہ فرض ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کی رعایا میں کوئی بھی مفلس نہ رہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ان کی ضروریات کو پورا

کرے تا کہ مفلسی کسی کے گھر داخل نہ ہو۔ ایک اچھے حکمران کی یہ نشانی ہے کہ اس کے دور حکومت میں کوئی بھی بھوکا نہ سوئے اور رعایا کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی مدد کرے۔ لیکن نظم "مفلسی" میں مفلس لوگوں کا حال جس طرح سے بیان کیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غریبوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں، نہ ہی کوئی ان کی عزت کرتا ہے۔

نظیرؔ کی ایک اور نظم "تل کے لڈو" محاکات کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں نظیرؔ نے تل کے لڈو کی لذت اور شیرینی کا تذکرہ کیا ہے۔ برسات کے موسم میں سردی کو دور کرنے کے لیے تل کے لڈو کھائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ تل کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔ اس لیے ٹھنڈ کو دور کرنے اور جسم کو گرمانے کے لیے انھیں کھایا جاتا ہے۔ نظیر "تل کے لڈو" کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پھیری والا لڈو گلی، بازاروں میں بیچتا ہے۔ مجھے بھی یہ لڈو پسند ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے جاڑے کے موسم میں کھانا نصیب کیے ہیں۔ نیز یہ کہ سردی کے موسم میں لوگ عمدہ پکوان بنا کر رکھتے ہیں اور ان میں لونگ، دار چینی اور شکر ملاتے اور طرح طرح کی چیزیں کھاتے ہیں۔ میں نے بھی گڑ منگوا کر لڈو تیار کیے۔ خوانچے میں لڈو رکھ کر پھیری لگا کر آواز دی کہ جس نے سردی کو دور کرنا ہے وہ مجھ سے آکر تل کے لڈو خرید لے۔ جاڑے کی سردی کا علاج لڈو ہی ہیں۔ کیوں کہ جب پہلوان کو بھی ٹھنڈ گھیر لیتی ہے تو وہ بھی تل کے لڈو ہی کھاتا ہے۔ اس موسم میں جب کسی سے ملنے جائیں تو یہ لڈو لے جائیں تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر جلیبی، پیڑے اور برفی لے کر جائے اس سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی تل کے لڈو کے ملنے سے ملتی ہے ۔ نظم کا بند ملاحظہ ہو:

جاڑے میں پھر خدا نے کھلوائے تل کے لڈو
ہر ایک خوانچے میں دکھلائے تل کے لڈو
کوچے گلی میں ہر جا بکوائے تل کے لڈو
ہم کو بھی ہیں گے دل سے خوش آئے تل کے لڈو
جیتے رہے تو یارو پھر کھائے تل کے لڈو[۲۷]

نظیرؔ نے جس طرح اپنی منظومات برسات اور پھسلن، برسات کی بہاریں، برسات کی اومس، تل کے لڈو، آدمی نامہ، اور مفلسی وغیرہ کی جس انداز سے محاکات اور منظر کشی کا استعمال کیا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ یہ منظومات محاکات کی بہترین نمونہ ہیں۔ علاوہ ازیں نظیرؔ کی نظم "برسات کی بہاریں" ان کی بیانیہ نظم ہے۔ برسات کے موسم میں بہار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جب برسات کا موسم آتا ہے تو ہر طرف باغ، سبزہ زار، ہوا کی ٹھنڈک، پانی کی بوندیں، بادل ہوا کے ساتھ مست، جل تھل، گھاس بارش کے قطروں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

بادلوں کی گونج اور چمک دھمک کیا کیا بہاریں دیکھا رہی ہے۔ گل و گلزار، جنگل ہرے بھرے، برسات کی جھڑی سے نالے بہہ رہے ہیں۔ مور ،بگلے، اور مینڈک شور مچا رہے ہیں۔ جنگلوں کے چار سوں سبزہ ہرا ہو رہا ہے۔ بگلے، مور، بٹیریں، قمری، تتر، ہدہد، کوئل اور فاختہ سب اس کی قدرت کے گن گاتے ہیں۔ جو انسان خوش ہے اس کی رات اچھی گزرے گی اور جو غم زدہ ہے اس کی ایک رات بھی بھاری ہے۔ جو لوگ محلوں میں ہیں وہ اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ مفلس اپنے کوٹھے کو تک رہے ہیں۔ نظیرؔ کی نظم برسات کی بہار کی منظر کشی اس خوش اسلوبی سے کی گئی ہے کہ بہار کے موسم کی ساری صورتحال ہماری آنکھوں میں نظر آنے لگتی ہے۔ بعد ازاں انھوں نے بیان کیا کہ اس موسم میں کسی کو مچھر اور پسو تنگ کر رہے ہیں اور کسی کو کنکھجورا اور بچھو کاٹ رہا ہے۔ مزید کہا کہ کوئی اس موسم میں پتلی دال بنا رہا ہے تو کوئی کیچڑ میں گرتا پھر رہا ہے۔ نظیرؔ نے اس نظم میں جزئیات سے کام لیتے ہوئے طویل انداز میں نظم لکھی ہے، برسات کے موسم میں جو بھی شے بھی پائی جاتی ہے اس کا تذکرہ کیا یعنی کھانا پینا، جنگل، چرند پرند، امید و یاس، گھروں کی حالت، کیچڑ، پھسلن، کیڑے مکوڑے وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے۔ نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہیں اس ہو امیں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں[۲۸]

نظیرؔ نے جس طرح سے محاکات سے اپنی شاعری میں کام لیا ہے۔ یہ ان کے تخلیقی عمل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے قلبی واردات کا بھی نتیجہ ہے جو نظیرؔ کے اعلیٰ علمی بصیرت اور خیال پر مبنی متنوع زاویوں سے ترتیب ہے۔ ان کی شاعری میں محاکات کا استعمال ان کی فکری اور تخیلاتی روش ہے۔ انھوں نے اپنی منظومات میں متحرک پہلوؤں کو پیش کیا۔ در حقیقت ان کے شعری کلام میں انسان کی سماجی و اخلاقی قدروں کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ انسان ابتدا سے لے کر آج تک سماجی و اخلاقی سفر کر رہا ہے۔ نظیرؔ کی جتنی بھی منظومات برسات پر لکھی گئی ہیں۔ وہ سب منظر کشی کی عمدہ مثالیں ہیں ،ان میں جاڑے کی بہارے، برسات کی بہاریں، برسات اور پھسلن، برسات کی اومس اور برسات کا لطف وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تل کا لڈو، پنکھا، اندھیری، آدمی نامہ، شہر آشوب، مفلسی اور نارنگی وغیرہ جیسی منظومات میں محاکات کا بیان ملتا ہے۔ نظیرؔ نے اپنے شعری کلام میں محاکات اور منظر کشی کو بھرپور انداز سے برتا ہے۔ انھوں نے مناظر فطرت کو اس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہماری

آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں منفرد انداز میں مناظر کا بیان کیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو شاعر اپنے شعری کلام میں محاکات کا بیان اس قدر دلچسپی سے کرتے ہیں کہ قاری پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ در حقیقت محاکات شاعری کی خوش نمائی، سج دھج، اثر آفرینی اور موزونیت کو بڑھاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ رؤپاریکھ، اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد بیستم (کراچی، اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴۶۔

۲۔ https://www.lexico.com/definition/poem، تاریخ ملاحظہ ۱۴ جون ۲۰۲۱۔

۳۔ طلعت حسین نقوی، نظیر اکبر آبادی کی کلام کا تنقیدی مطالعہ (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء)، ص ۳۱۲۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔

۵۔ طلعت حسین نقوی، نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۱ء)، ص ۳۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۵۲۔

۷۔ طلعت حسین نقوی، نظیر اکبر آبادی کی کلام کا تنقیدی مطالعہ، ص ۳۴۴۔

۸۔ ارسطو، شعریات مترجم شمس الرحمن فاروقی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۳۔

۹۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم (اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۸۴ء)، ص ۶۔

۱۰۔ توقیر احمد، اقبال کی پیکر تراشی (نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس پٹوری ہاؤس دریا گنج، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۴۔

۱۱۔ اردو لغت تاریخی اصول پر

محاکات=http://udb.gov.pk/result.php?search، تاریخ ملاحظہ ۱۷ جولائی ۲۰۲۱

۱۲۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، ص ۶۔۷۔

۱۳۔ سلام سندیلوی، اردو شاعری میں منظر نگاری (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۸ء)، ص ۲۰۔

۱۴۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، ص ۲۳۔

۱۵۔ عبدالرحمن، مراۃ الشعر (لکھنؤ: اترپردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ص ۲۶۳۔

۱۶۔ریاض احمد،تنقید سرسید کے دور میں(لاہور:بہترین ادب مکتبہ اردو،۱۹۵۲ء)،ص۵۴۸۔

۱۷۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی(لکھنؤ:منشی نول کشور،۱۹۵۱ء)،ص۵۶۱۔

۱۸۔ایضاً،ص۵۶۳۔

۱۹۔ایضاً ،ص۶۸۳۔

۲۰۔طلعت حسین نقوی،نظیر اکبر آبادی کی کلام کا تنقیدی مطالعہ،ص۳۳۹۔

۲۱۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۶۸۴۔

۲۲۔ایضاً،ص۶۸۵۔

۲۳۔ایضاً،ص۶۵۶۔

۲۴۔افضل حمید،ذوالفقار علی،نظیر اکبر آبادی اور فلسفہ زر
http://alhamd.aiu.edu.pk/wp-content/uploads/2020/01/6-urdu-issue-12th-dr-mohammad-afzal.pdf

ملاحظہ تاریخ ۲۱جولائی ۲۰۲۱،بوقت ۱۱:۵۵۔

۲۵۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۶۶۰۔

۲۶۔ایضاً،ص۶۶۱۔

۲۷۔ایضاً،ص۵۶۸۔

۲۸۔ایضاً،ص۵۴۹۔۵۵۰۔

باب پنجم:

نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے اسلوب کے اثرات

اسلوب انگریزی زبان کے لفظ style کے ہم معنی ہے۔لفظ اسلوب، عربی سے مشتق ہے۔اسلوب کے معنی انداز نگارش اور طرز بیان کے ہیں۔عام طور پر اس سے مراد کسی تخلیق کار کا مخصوص انداز تحریر، وضع، سلیقہ اور فکر کے ہیں۔اسلوب کسی بھی ادبی شخصیت کے تخیلات اور ذہنی صلاحیت کی عکاسی کرتا ہے۔ہر مصنف کی تخلیق کا اپنا ایک الگ طریقہ کار ہے جو اس (مصنف) کے اسلوب کو دوسرے مصنفین کے بالمقابل انفرادی حیثیت عطا کرتا ہے۔اسلوب در حقیقت لکھاری کے ذاتی ہنر، الفاظ و معنی، استعاروں، محاوروں، ضرب الامثال، سوز و گداز اور فصاحت و بلاغت کا مجموعہ ہے۔اسلوب کی دو اقسام ہیں۔شعری اور نثری اسلوب۔شعری اسلوب میں جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے جبکہ نثری اسلوب میں خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔یعنی اسلوب کسی بھی مصنف کے جذبات، خیالات اور انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔اسلوب کی تعریف و توضیح کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے باوجود اس کے بہت سے مصنفین، ناقدین، ادباء، مفکرین اور دانشوروں نے اپنی سوچ و فکر Style یعنی اسلوب کی تعریف کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔اکسفورڈ انگریزی ڈکشنری میں تعریف یوں کی گئی ہے:

A way of painting, writing, composing, building etc. Characteristic of a particular period, place, person, or movement.[1]

علی رفاد فتیحی نے اپنی تصنیف "ساخت اور اسلوب" میں مشہور مفکر والٹر پیٹر کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

Style is a certain absolute and unique manner of expression a thing in all its intensity and color.[2]

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی تصنیف زبان ،اسلوب اور اسلوبیات میں امریکی مصنف ایمرسن کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسان کا اسلوب اس کی ذہنی آواز ہے۔[۳]

طارق سعید اپنی تصنیف اسلوب اور اسلوبیات میں پروفیسر محمد حسن کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اسلوب وہ قوت اظہار ہے جس میں صدیوں کی تہذیب بولتی ہے۔ اسلوب وقت کا بھی ہوتا ہے۔ زبان کا بھی، صنف کا بھی اور مصنف کا بھی۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ زبان کی روایات میں نمو کی قوت کتنی ہے اور اظہار اور فروغ میں کونسی توانائیاں کار فرما ہیں۔ ہر اسلوب محض صاحب اسلوب کی وراثت اور ذہانت ہی کی گواہی نہیں دیتا بلکہ کسی زبان اور ادب کے چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ بھی دیتا ہے اور ہر قسم کی دولت کو آفتاب عالم تاب کی طرح چمکا کر از سر نو دولت بیداد کا مرتبہ دیتا ہے۔[۴]

اسلوب کسی بھی ادبی فن پارے کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اسلوب اظہار کا ایسا وسیلہ ہے جس سے تخلیق کار کی شخصیت کا عکس جھلکتا ہے۔ ایک مصنف کی تحریر پر اس کے ارد گرد کا ماحول، رہن سہن، رسم و رواج، عقائد و روایات، سماج، سیاست اور معاشی حالات وغیرہ کے اثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک تخلیقی شاہکار کو خوش نما اور پر تاثیر بنانے میں اسلوب کی خصوصیات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسلوب کی ایک خاصیت یہ ہے کہ مصنف کی تحریر میں سادگی، سلاست و روانی، تشبیہ، استعارہ، سوز و گداز، شگفتگی، فصاحت و بلاغت، مزاح، ربط و ضبط اور اختصار موجود ہو۔ دوسری خاصیت یہ کہ مصنف کو اپنی تحریر میں ثقیل، مقفٰی و مسجع، پیچیدہ اور باریک بین عبارت آرائی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ تیسری خاصیت یہ کہ اس (مصنف) کا انداز نگارش اتنا دلچسپ ہو کہ قاری تحریر کو ایک بار پڑھنا شروع کرے تو اسے مکمل کر کے ہی چھوڑے یعنی تحریر اتنی روکھی پھیکی اور الجھی ہوئی نہ ہو کہ قاری اس کو پڑھتے ہوئے بوجھل محسوس کرے۔ تخلیق کار کو اپنی تحریر میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ با معنی، معلومات افزا اور مفید بھی ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی بھی زمانے کا تعین کرنے کے لیے اس عہد کا اسلوب نہایت کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ اس باب میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں سعدیؒ کے اسلوب اور تلمیحات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ نظیرؔ اور سعدی شیرازی کے اسلوب کی مشترک صفات کا جائزہ لیں گے۔

اردو ادب میں شاعری کی صنف کے موضوعات عشق و محبت تک محدود تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے شاعری کے مروجہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنی شاعری میں سماج، معاش اور اخلاق کو اپنا مطمع نظر بنایا ہے۔ انھوں نے وہ تمام تراکیب، الفاظ، جملے اور فقرے استعمال کیے جنہیں مشاہیر ادب حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یعنی نظیرؔ نے شاعری کی صنف کو نئی سمت سے متعارف کروایا۔ دیگر مصنفین کے نزدیک نظیرؔ، سعدیؒ کی شخصیت سے بہت

زیادہ متاثر تھے اس لیے ان (سعدیؒ) کی طرح نظیرؔ نے بھی پند و نصائح، سادہ بیانی اور حکیمانہ اخلاق کو اپنی شاعری کا منبع و مقصد بنایا ہے۔ ان دونوں کے شعری کلام میں کافی قدریں مشترک ہیں گو کہ نظیر اکبر آبادی، سعدیؒ کی طرح بے شمار ممالک کی سیر نہ کر سکے باوجود اس کے ان کے شعر و سخن میں کسی طور کمی موجود نہیں ہے۔ نظیرؔ نے اپنے شعری کلام کو سعدیؒ کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ سعدی اور نظیرؔ کے کلام میں مماثلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سعدیؒ کا عہد سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے زبوں حالی کا شکار تھا۔ عبد الاحد خاں خلیل، سعدیؒ کے عہد کے حوالے سے لکھتے ہیں: "سعدیؒ نے جس عہد میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہ سیاسی نقطہ نظر سے فارس کے لیے انتہائی پر آشوب اور ہنگامہ خیز تھا۔ ہر طرف آشفتہ حالی اور پریشان روزگاری کا دور دورہ تھا اور کسی فرد بشر کو سکون و اطمینان نصیب نہ تھا۔"[5] یہی اثرات ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں مثال ملاحظہ ہو:

ندانی کہ من در اقالیم غربت	چرا روز گارے بکردم در نگی
تمہیں معلوم نہیں کہ دیگر اقالیم میں اپنے وطن سے دور	میں نے اتنے دن کیوں دیر لگائی
بروں رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم	جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی
میں تنگ ترکان (شیراز) سے نکل کھڑا ہوا جبکہ میں نے دیکھا	کہ دنیا کسی حبشی کے بالوں کی طرح الجھی ہوئی ہے
ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن	چو گرگاں بخو نخوارگی تیز چنگی
سب (بظاہر) انسان معلوم ہوتے ہیں	بھیڑیوں کی طرح خونخوار اور تیز چنگ ہو رہے تھے[6]

سعدیؒ کی شاعری میں جہاں اپنے عہد کے بادشاہوں کی نااہلی اور بدحالی کا تذکرہ ملتا ہے۔ تو ایسے میں نظیر اکبر آبادی بھی پیچھے نہیں رہے انھوں نے بھی "شہر آشوب" جیسی نظم لکھ کر آگرہ کی معاشی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی قدروں کی بد حالی کا تذکرہ کیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ
آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند[7]

ان اشعار سے یہ بات واضح ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کی شکستہ حالت کو اس نظم میں مفصل انداز سے بیان کیا ہے ۔ آگرے کے اتنے خراب حالات ہو چکے ہیں کہ ہر انسان بے زر اور بے سکون ہے، ہر کسی کو پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ سعدیؒ کے اثرات نظیرؔ کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے میں عبدالغفور شہباز، سعدی شیرازی سے نظیرؔ کی محبت اور لگاؤ کے متعلق لکھتے ہیں:

> مناسبت فطری سعدیؒ سے نظیرؔ کو ایک عشق کا مرتبہ بخشتی ہے ۔ مکتب میں جب وہ گلستان و بوستان کا درس دیتا ہے تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ اس پر قریب قریب وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جو صوفیوں کو عالم وجد و حال میں۔ اس پر سعدیؒ کے کلام کا سماں چھا جاتا ہے۔ وہ اس کی شرح نہیں کرتا بلکہ خود شرح ہو جاتا ہے ---------وہ ایک خاص خانقاہ میں پہنچا ہوا ہے اور ایک خاص شیخ سے فیض لے رہا ہے۔ اس کی کیفیت پھیل رہی ہے اور مستفیضوں کو اپنے رنگ میں رنگ رہی ہے۔[8]

نظیر اکبر آبادی اور سعدی شیرازی کے افکار میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں شخصیات کے درمیان زمانی فاصلہ موجود ہے باوجود اس کے ان (نظیر) کی شاعری میں سعدیؒ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جس طرح گلستان و بوستان میں پند و نصائح کی تلقین کی گئی ہے بالکل ایسے ہی نظیرؔ کی شاعری بھی اخلاقی تصورات کی آئینہ دار ہے۔ اخلاقیات کے دائرہ کار میں توکل کو اہمیت حاصل ہے یعنی اخلاقیات میں سب سے اہم بات اللہ رب العزت کی ذات پر بھروسہ رکھنا۔ یعنی انسان پر کیسی بھی پریشانیاں اور مشکلات آجائیں وہ کسی کو برا بھلا کہے بغیر اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دے کہ وہ سب بہتر کرنے والا ہے۔ سعدیؒ کی توکل کے حوالے سے مثال ملاحظہ ہو:

ے جہاں اے برادر نہ ماند بہ کس	دل اندر جہاں آفریں بندو بس
اے بھائی دنیا کسی کے ساتھ نہیں رہے گی	دل خدا سے لگانا چاہیے باقی کچھ نہیں
مکن تکیہ بر ملک دنیا و پشت	بسیار کس چو تو پرور دو کشت
دنیا کے ملک پر بھروسہ نہ کر اور اسکے سہارے نہ رہ	کیونکہ دنیا نے بہت سے تجھ جیسے پرورش کیے اور مار ڈالے
چو آہنگ رفتن کند جان پاک	چہ بر تخت مردن چہ بروئے خاک
جب پاک جان جانے کا ارادہ کرے	تو خاک اور تخت پر مرنا دونوں برابر ہے[9]

یہی اثرات ہمیں نظیرؔ کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں بھی سعدیؒ کی طرح اخلاقیات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا۔انھوں (نظیرؔ) نے بھی اپنے شعری کلام میں عوام کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے اخلاقیات کا درس بھی دیا ہے۔ایسے میں نظیرؔ کے ہاں بھی توکل کی تلقین کی گئی مثال ملاحظہ ہو:

اے دل کہیں تو جا کے نہ اپنی زباں ہلائے
اور درد دل کا اپنے کسی کو تو مت سنائے
مانگ اس سے جس کے ہاتھ سے تو پیٹ بھر کے کھائے
مشہور یہ مثل ہے کہوں کیا میں تجھ سے ہائے
غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی دلائے[10]

سعدیؒ کے اخلاقی اثرات کا رنگ بھی نظیرؔ کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان کی تحریروں میں آبشار کی سی روانی، جملوں میں صفائی، تخیل میں سادہ بیانی اور لفظوں میں شیرینی، شگفتگی اور لطافت بیان موجود ہے۔گلستان و بوستا ن کے تاثرات نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں صاف جھلکتے ہیں۔انھوں (نظیرؔ) نے اپنی تحریر میں پند و نصیحت کو خوش طبعی سے پیش کیا ہے۔جس طرح سعدی شیرازی کے ہاں تصوفانہ رنگ موجود ہے ایسے ہی نظیر اکبر آبادی کے ہاں بھی تصوفانہ رنگ پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں نظیرؔ کی شاعری پر سعدی شیرازی کے سماجی اور اخلاقی اقدار کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔دیگر مصنفین نے سعدیؒ اور نظیرؔ کے اسلوب میں سادہ بیانی کی مماثلت کو تحریر کیا ہے۔اس حوالے سے رام بابو سکسینہ نے سعدی شیرازی سے نظیرؔ کے اسلوب کی مناسبت کے متعلق کہا ہے کہ:

> نظیرؔ کے کلام میں سے ان کے معمولی شعر نکال ڈالے جائیں تو ان کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔نظیر کا مقابلہ اس معنی میں سعدیؒ سے خوب ہو سکتا ہے۔کیوں کہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوف کا رنگ ہے، دونوں عاشقانہ رنگ کے استاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔۔۔ان کی صوفیانہ نظمیں بہت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہت سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔[11]

سعدی شیرازی کی شخصیت اور نظریے نے نظیرؔ کو بے حد متاثر کیا ہے۔نظیرؔ کے شعری کلام پڑھنے سے سعدیؒ کے اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔جو حسن بیاں، نرم لہجہ، سوز و گداز اور شگفتگی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے وہی حسن بیاں نظیرؔ کے ہاں پایا جاتا ہے۔سعدی شیرازی نے اپنی حکایات کی روشنی میں نیکی، شکر، صبر و تحمل، توکل اور

حکمران طبقے کو مساوات کا درس دیا ہے۔ یہاں پر بھی نظیرؔ پیچھے نہ رہے انھوں نے بھی اپنی منظومات اور غزلیات کی بدولت ان تمام موضوعات کو زیر بحث لائے جو سعدیؒ نے بیان کیے ہیں۔ دونوں شخصیتیں اخلاقیات کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کی حامل ہیں۔ سعدی شیرازی اپنے موضوعات میں انسانی اصلاح کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یعنی ان کا مقصد اپنے عہد کے بادشاہت وقت کو اخلاقی و سماجی اقدار کے بگاڑ سے باخبر رہنے اور فکر آخرت کی طرف توجہ دلانا تھا۔ سعدیؒ کسی بھی تحریک سے وابستہ نہ تھے۔ بلکہ وہ ہمیشہ ایک صالح شخصیت تھے۔ نظیرؔ نے بھی ان کی پیروی کی اور اپنے عہد کے حکمران طبقے کو ان کی کمزوریوں، عوام کے بے بسی و لاچاری، فانی دنیا اور آخرت کے انجام سے آگاہ کیا ہے۔ مخمور اکبر آبادی نے اپنی تصنیف روح نظیر میں نظیر اکبر آبادی کی تخلیق پر اثرات کے حوالے سے کہا ہے کہ:

> نظیرؔ کی شاعری میں مہتم بالشان خودداری اور احساس بشریت کی ایسی جھلک پائی جاتی ہے جو بہیمانہ جذبات اور دل کی پر غضب تحریکوں کی ترویج کے لیے ناموزوں ہے اور ان کے کلام کو شریفانہ، حسین اور مؤثر خیالات کے اظہار کا لاثانی ذریعہ بناتی ہے۔ یہ اثر کچھ تو سعدیؒ اور دیگر قدیم اساتذہ کے دانستہ اتباع سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ سطحی خیالات سے احتراز کرنے سے۔[12]

سعدی شیرازی کی تخلیق فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔ جس طرح سعدیؒ کے ہاں سادگی، سلاست وروانی پائی جاتی ہے بالکل ایسے ہی نظیرؔ کے انداز نگارش میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ انھوں نے اپنے شعری کلام میں سعدیؒ کا سا اسلوب اختیار کرتے ہوئے انتہائی سادگی کے ساتھ اپنے نظریات کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں وہی شائستگی، سلیقگی، تراش خراش، محاورات، تشبیہ، فصاحت و بلاغت اور الفاظ کا بر محل استعمال نظر آتا ہے۔ جو سعدیؒ کے اسلوب بیاں میں پایا جاتا ہے۔ موضوعات کے بیان کے لیے انھوں (نظیرؔ) نے سعدیؒ کی طرح سادہ اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ سعدیؒ اور نظیرؔ کی سادہ بیانی ایک بحر ذخار ہے۔ سعدیؒ کی سادگی، سلاست و روانی نے نظیرؔ کو شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر کیا ہے۔ مخمور اکبر آبادی نے نظیرؔ کے اسلوب بیان میں سادگی کو سعدیؒ سے مشابہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> میاں نظیر کی سادگی، تمام و کمال، سعدیؒ کے رنگ یا چھاپ کی سی سادگی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسی بات کہتے ہیں، جو صاف، ستھری اور بھلی ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سننے والے کو مخاطب کر کے بھی کہتے ہیں، تخاطب کے انداز سے بات کا اثر بہت بڑھ جاتا ہے۔ بات غور و غوض، سوچ و بچار کی محتاج نہیں رہتی اور شربت کے گھونٹ کی طرح گلے سے اتر جاتی ہے۔[13]

سعدی شیرازی کی شخصیت علم و حکمت کا سرچشمہ ہے۔ ان کی تصانیف گلستان و بوستان کا اسلوب اس قدر پر لطف اور سادہ ہے کہ اس نے دنیا ادب کو متاثر کیا ہے۔ آج تقریباً دنیا کے ہر کونے میں ان کی کتب کے تراجم دستیاب ہیں۔ ان کی شخصیت کو پر اثر بنانے میں ان کے اسلوب بیان نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سعدی شیرازی کے انداز نگارش کی خوبصورتی یہ ہے کہ انھوں نے ثقیل، مقفی و مسجع عبارت آرائی کو اپنے طرز بیان کا حصہ بننے نہیں دیا۔ ان کی یہی وہ خصوصیت ہے، جس نے قارئین کے دل کو متاثر کیا ہے۔ سعدیؒ کا یہی نکتہ نظر اردو ادب کے شاعر نظیر اکبر آبادی کو پسند آیا اور انھوں نے بھی سادگی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ دونوں شخصیات اپنے اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سعدی شیرازی کی حسن خوبی، سادہ بیانی ہے جو انھیں آج دنیا بھر میں زندہ و جاوید رکھے ہوئے ہے۔ ان کی تصانیف گلستان و بوستان کے اسلوب کی سادگی نے ہر خاص و عام کو متاثر کیا ہے۔ مخمور اکبر آبادی نے سعدی شیرازی کی سادگی کے متعلق لکھتے ہیں:

> سعدی کی پر مغز شعری اور اسلوب بیان میں، جو سادگی اور ایک نوع خاص دلنوازی اور پر اثری پائی جاتی ہے، جسے ہم، آپ اپنی قسم کی ادبی جدت، کہہ سکتے ہیں۔ یہہ بجنسہ وہ کشش وہ کیفیت ہے جو کلاسیکل ادب کی نوعی خصوصیت بھی ہے اور امتیازی خصوصیت بھی۔ [۱۴]

سعدی شیرازی کی سادہ بیانی حوالے سے شعری مثال ملاحظہ ہو:

من نگویم کہ طاعتم بپذیر　　قلم عفو بر گناہ ہم کش
میں یہ نہیں کہتا کہ میری عبادت کو قبول کر　　مگر معافی کا قلم میرے گناہ پر کھینچ دے [۱۵]

یوں دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی کے شعری کلام میں بھی سادگی کا عنصر موجود ہے مثال ملاحظہ ہو:

باغ جنت ہے آج یہ درگاہ
پھول پھولے ہیں فیض کے دلخواہ
دیکھو رضواں بہاریاں کی واہ!
دل میں کہتا ہے دمبدم واللہ
رشک ہے گلشن بہشتی کا
عرس حضرت سلیمؒ چشتی کا [۱۶]

سعدیؒ اور نظیرؔ کے اسلوب میں جہاں بہت سی قدریں مشترک ہیں وہاں ان میں ایک انفرادی عنصر بھی موجود ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے شعر و سخن میں جزئیات نگاری سے بھرپور کام لیا ہے۔ یعنی انھوں نے کڑی سے کڑی

کو جوڑا اور کسی بھی جز کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ جبکہ سعدیؒ کے ہاں یہ عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔ گو کہ سعدی شیرازی نے اپنی زندگی میں بہت سے دیار کی سیر کی لیکن ان کے ہاں جزئیاتی رنگ نظر نہیں آتا ہے۔ نظیر نے جو کام جزئیات نگاری سے لیا ہے وہ سعدیؒ کے ہاں نظر نہیں آتا۔ یعنی نظیرؔ نے اپنے شعری کلام میں جابجا محاورات، روزمرہ، ضرب الامثال، عام بول چال، مقامی زبانوں کے الفاظ، صنائع بدائع، طنز و مزاح، پر کشش تشبیہات و استعارات اور پنجابی، عربی اور فارسی کے الفاظ کو جزئیات نگاری میں استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی تحریروں میں لفظوں کا خوبصورت چناؤ، مناظر فطرت اور تصویر کشی کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ انھوں نے اپنے شعری کلام میں جزئیات کے ذریعے کسی بھی واقعہ اور قصہ کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے کہ وہ واقعات اور حالات ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ طلعت حسین نقوی اپنی تصنیف میں نظیرؔ کی جزئیات نگاری کے متعلق عبدالباری آسی کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لفظوں کی وہ افراط کی ایک ذخار دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے، معانی کی وہ بہتات کہ شہوار موتیوں کا انبار نظر آتا ہے بیان کی سلاست ایسی کہ کہیں رکاوٹ کا نام نہیں، بندش کی وہ چستی کہ کڑی سے کڑی ملی چلی جاتی ہے، تصویر کشی اور محاکات کا یہ عالم کہ جب تاج گنج کے روضے کی تعریف ہم پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اس کے ایک ایک نقش و نگار ایک ایک جالی کو دیکھلیتی ہے۔[۱۷]

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ہمیں جزئیات نگاری کے بے شمار نمونے ملتے ہیں ان میں آدمی نامہ، بنجارا نامہ، برسات، کبوتر بازی اور چڑیوں کی تسبیح وغیرہ شامل ہیں۔ مثال کے طور پر نظم "کبوتر بازی" کا بند ملاحظہ ہو:

کیا بلبل و قمری و چہے پدڑی و پدّے
چنڈول، اگن، لال، بئے، ابلقے، طوطے
کیا طوطی و مینا و پئی تیتر و شکرے
طائر ہیں غرض بازی اشغال کے جتنے
کی غور تو سب سے سر فراز کبوتر[۱۸]

علاوہ ازیں نظم "چڑیوں کی تسبیح" میں بھی جزئیات نگاری سے بھرپور کام لیا گیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

بوم چغد اور سبزک ابابیل اور چکور یں شام چڑی
کھنجن، جھپاں، لوے، کلنگ اور غوغائی کی دھوم پڑی

تتلی، ٹڈی، ڈانس ، بھنبھیری، کتری بھنوری اور بڑی
مکھی ، مچھر، پسو، بھنگے بول رہے سب گھڑی گھڑی
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں[19]

یوں دیکھا جائے تو ہمیں نظیر اکبر آبادی کے شعری کلام میں جزئیات نگاری کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی ۔ جس طرح اوپر پیش کردہ شعری مثالوں سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک بند میں بے شمار جزئیات کا استعمال کیا ہے تو پوری نظم میں نظیرؔ نے لاتعداد جزئیات سے کام لیا ہے۔ اس کے برعکس سعدی شیرازی کی تحریروں پر نظر ڈالیں تو انھوں نے سادہ بیانی کو اختیار کیا ہوا ہے۔ ان کی مثنوی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اگر روزی بدانش در فزود ے زناداں تنگ روزی
اگر روزی عقل کی وجہ سے بڑھتی تو نادان سے زیادہ کوئی بدنصیب اور بھوکا نہ ہوتا
بناداں آنچناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیراں بماند
خدا نادان کو اس طرح روزی پہنچاتا ہے کہ عقلمند اس میں حیراں رہ جاتا ہے[20]

نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدی شیرازی کے اسلوب کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے بعد اب ہم تلمیح کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی تلمیحات کا جائزہ لیں گے۔

تلمیح:

تلمیح کے لغوی معنی رمز یا اشارہ کے ہیں۔ کسی تاریخی، مذہبی، سیاسی اور اخلاقی واقعہ یا قصہ کی طرف اشارے کے ہیں۔ تلمیح شعر و سخن کا اہم جزو ہے۔ اردو لغت میں تلمیح کے معنی "کلام میں کسی مشہور مسئلے، حدیث، آیات قرآنی یا قصے یا حدیث یا مثل یا کسی اصطلاح علمی و فنی وغیرہ کی طرف اشارہ کرنا۔"[21] یعنی کسی بھی عہد کے حالات و واقعات جاننے کے لیے تلمیح کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے کسی بھی زمانے کے تہذیبی و تمدنی حالات و واقعات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس میں شاعر ایک یا دو الفاظ کی مدد سے کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جس سے قاری اس واقعہ کے پس منظر سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس سے کلام میں خوش نمائی، لطافت، اور فصاحت و بلاغت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔ تلمیح سے کسی بھی کلام کو نئے معنی اور مخصوص مفاہیم ملتے ہیں۔ محمود نیازی تلمیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

> تلمیح کو استعمال کرنے کا اصل مقصد کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب کی ادائیگی ہے۔۔۔۔۔طول طویل کہانیاں اور قصوں کو بار بار دہرایا جائے تو سننے والے اکتا جاتے ہیں۔۔۔۔اسی بات کو اشاروں میں بیان کر دیا جائے تو گفتگو میں فصاحت و بلاغت پیدا ہو جاتی ہے اور سامع کو بھی ہر بار نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ تلمیحی الفاظ گو مختصر ہوتے ہیں لیکن اپنے اندر وسیع مطالب پنہاں رکھتے ہیں۔[۲۲]

تلمیح کا مقصد کم سے کم لفظوں میں کسی بڑے واقعہ، قصہ یا کہانی کو بیان کرنا کے ہیں۔ اس میں گزشتہ واقعات اور تاریخی داستانوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں بے شمار تلمیحات ان میں آتش نمرود، آدم، ابن مریم، حسن یوسف، فرہاد، شیریں، ساقی کوثر، ابراہیم، کیقباد، سکندر اعظم، یعقوب، کوہ طور، لیلیٰ، مجنوں، عبد القادر جیلانی اور ہارون الرشید وغیرہ کا ستعمال کیا گیا ہے۔ ان سب کے علاوہ بھی لاتعداد تلمیحات شامل تحریر رہی ہیں۔ اس سے نہ صرف کلام میں معنی اور موزونیت پیدا ہوتی ہے بلکہ اس سے شعری کلام کی فصاحت و بلاغت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب ہم ان اسلامی اور تاریخی تلمیحات کا ذکر کریں گے جو دونوں شخصیات کے ہاں موجود ہیں اور نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدی شیرازی کی تلمیحات کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

سعدی شیرازی نے اپنی تصنیف گلستان و بوستان میں بے شمار تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں دو طرح کی تلمیحات مستعمل ہیں۔ یعنی اسلامی اور تاریخی تلمیحات۔ جبکہ یہی اثرات ہمیں نظیر اکبر آبادی کے شعری کلام میں نظر آتے ہیں۔ یعنی نظیر کے ہاں بھی اسلامی اور تاریخی تلمیحات استعمال کی گئی ہیں۔ پہلے ہم سعدی شیرازی کی تاریخی تلمیحات پر روشنی ڈالے گے اور ان کے اثرات نظیر کی شاعری پر دیکھیں گے۔ سعدی شیرازی کی حکایت "ہارون الرشید کا انصاف"[۲۳] میں بیان ہوا ہے کہ بنو عباس کے خلیفہ ہارون الرشید کے پاس ایک روز ان کا بیٹا غصے کی حالت میں آیا تو انھوں نے پوچھا کیا مسئلہ ہے تو ان کے بیٹے نے کہا کہ فلاح سپاہی کے بیٹے نے مجھے ماں کی گالی دی۔ اس پر ہارون الرشید نے مجرم کی سزا کے متعلق اپنے درباریوں سے رائے طلب کی تو ایک نے کہا قتل کر دیا جائے، دوسرے نے کہا اس کے والد کی جائیداد ضبط کر لی جائے، تیسرے نے کہا اس کی زبان کاٹ دینی چاہیے۔ سب کی رائے سننے کے بعد ہارون الرشید نے کہا کہ ہمیں اس معاملے میں ذرا برابر بھی زیادتی نہیں کرنی چاہیے ۔ بہتر یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ یعنی اس حکایت میں 'ہارون الرشید' کی تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ ہارون الرشید عباسی خلیفہ تھے ان کے عہد میں سائنس، ثقافت، موسیقی، شاعری، علمی اور سیاسی حالات مستحکم تھے۔ یہ غریب لوگوں کے مسائل کو احسن طریقے سے انجام دیتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے میں عدل و انصاف کا پرچار کیا تھا۔

سعدی شیرازی کی حکایت "حق گو درویش"[۲۴] میں بیان ہوا کہ 'حجاج بن یوسف' کے عہد میں ایک بزرگ ایسے تھے جن کی دعا قبول ہوتی تھی۔ حجاج نے اس بزرگ سے اپنے حق میں دعا کی درخواست کی۔ بزرگ نے ہاتھ اٹھا کے فرمایا، اے اللہ! اسے موت دے دے۔ حجاج یہ دعا سن کر حیران ہوئے اور کہا یہ میرے حق میں کیسی دعا ہے؟ تو بزرگ نے فرمایا۔ اس دعا سے تمھارے اعمال اور سیاہ نہ ہوں گے اور مسلمانوں کو بھی تمھارے ظلم و ستم سے آزادی مل جائے گی۔ اس حکایت میں 'حجاج بن یوسف' کی تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ حجاج بن یوسف عبدالملک اموی کے عہد میں عراق کا گورنر بنا۔ علاوہ ازیں حجاز کے بھی گورنر رہے۔ انھوں نے بہت سے علاقوں کو اپنے ماتحت کرنے اور حکمرانی کے لیے قتل و غارت کی اور بے گناہوں کا خون بہایا۔ نہ صرف یہ بلکہ علماء اور اولیاء کے ساتھ بد سلوکی کی۔ حجاج انتہائی سخت گیر اور بے رحم انسان تھا۔ اس نے ظلم و ستم اور بربریت کی تاریخ رقم کی۔ آخر کار اسے اذیت ناک موت آئی۔

سعدی شیرازی کی حکایت "سکندر رومی کا جواب"[۲۵] میں بیان ہوا ہے کہ سکندر اعظم سے کسی نے سوال کیا دنیا کے بے شمار ممالک کو آپ نے کیسے فتح کیا؟ گزشتہ بادشاہوں کے پاس مال و دولت اور فوج کی کسی طور کمی نہیں تھی لیکن وہ اتنے کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اوّل اللہ تعالیٰ کی مدد سے، دوسرا یہ کہ جن ممالک کو فتح کیا اس ملک کے عزت دار لوگوں اور اچھے کارنامے انجام دینے والوں کو ہمیشہ عزت دی، تیسرا عوام کو تنگ نہیں کیا۔ یہاں پر "سکندر اعظم" کی تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ سکندر اعظم نے تعلیم و تربیت ارسطو جیسی شخصیت سے حاصل کی۔ ان کا شمار بہترین رہنماؤں اور فوجی کمانڈروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف کم عمری میں بادشاہت سنبھالی بلکہ آدھی دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ ان کی فتوحات کا سلسلہ یونان سے لے کر ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ سکندر اعظم شاندار حکمت عملی کی بدولت دشمن کو شکست دیتے تھے۔

سعدی شیرازی کی حکایت "بادشاہ کا خواب"[۲۶] میں بیان کیا ہے کہ ملک خراسان کا بادشاہ اپنے خواب میں سلطان محمد سبکتگین کو قبر میں گلی سڑی حالت میں پڑا دیکھائی دیتا ہے لیکن اس کی آنکھیں سلامت ہیں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوئے تو امیروں اور وزیروں سے اس کی تعبیر پوچھی۔ اسی وقت ایک درویش آیا اور کہا! سلطان محمد سبکتگین حیران ہے جو حکومت اس نے محنت سے حاصل کی تھی اب وہ غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس حکایت میں سعدی شیرازی نے "سلطان محمد سبکتگین" کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔ سبکتگین سلطنت غزنویہ کے بانیوں میں سے تھے۔ انھوں نے پنجاب کے حکمران راجہ جے پال اور ان کے ساتھ دینے والے دہلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کے ٹڈی دل لشکر کو شکست دے کر پنجاب میں اپنی حکومت کو وسعت دی۔

سعدی شیرازی کی اوپر بیان کردہ تاریخی تلمیحات کے علاوہ بھی بہت سی تلمیحات کا ذکر ان کی حکایات میں ملتا ہے۔ ان میں "بادشاہ نوشیروان" جو عادل تھے۔ ان کے عہد میں دار لحکومت بغداد تھا اور انھوں نے رومیوں کو شکست دی۔ "حاکم شیراز اتابک سعد بن زنگی" جو فارس کے حکمران تھے۔ "سلطان قزل ارسلان" جو سلجوقی سلطان تھے۔ سلجوق سلطنت کو وسعت دی اور باطنیوں کو مکہ، مدینہ سے نکالا۔ علاوہ ازیں "شاہ ایران ہرمز"، زوزان نامی بادشاہ"، "حاکم شیراز تکلہ بن زنگی"، "بادشاہ عمرولیث"، "تاتاری" وغیرہ جیسی تلمیحات شامل ہیں۔ سعدیؒ کی ان تاریخی تلمیحات کے اثرات نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ یعنی نظیرؔ نے بھی اپنی منظومات اور غزلیات میں تاریخی تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر نظیرؔ کی نظم اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے بیمار کو تجھ بن شفا ممکن نہ تھی ہونی
فلاطوں کیا اگر خود عیسیٰ گردوں نشیں آتا[۲۷]

ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنھیں کہتے تھے لوگ
کیقباد وقیصر و کیخسر د و افراسیاب [۲۸]

یہ سنتے ہی حیدر نے زرہ، خود پہن کر
دلدل پہ چڑھے کہہ کے جو "اللہ اکبر"
آئے وہ وہاں پر تھا جہاں قلعہ خیبر
کاوے کو لگا کر دیا رہوار کو چکر
نیزے کو ہلا یا کبھی ترچھا کبھی آڑا[۲۹]

نظیر اکبر آبادی نے اپنے شعری کلام میں تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ نظیرؔ کی منظومات اور غزلیات میں تاریخی تلمیحات کا بیان بہت کم ملتا ہے۔ لیکن انھوں نے سعدیؒ کی تاریخی تلمیحات کے اثرات قبول کرتے ہوئے قلعہ خیبر، قیصر، کیقباد اور فلاطوں جیسی تلمیحات زیر قلم لائے ہیں۔ ان تلمیحات پر ایک جامع نظر ڈالیں تو:

۱۔ **کیقباد:** یہ قدیم ایران کے بادشاہوں کے لیے بطور شاہی نام استعمال کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سلطان علاؤالدین کیقباد اور سلطان معیزالدین کیقباد وغیرہ۔

۲۔ **قیصر:** یہ رومی سلطنت یعنی بازنطینی شہنشاہوں کے لیے بطور لقب مستعمل تھا۔

۳۔ **فلاطوں:** یعنی افلاطون یونانی سائنسدان تھے۔ انھیں مغربی فلاسفر اور حکمت و دانش کا استاد مانا جاتا ہے۔

۴۔ **قلعہ خیبر:** نظیرؔ نے اپنی نظم "خیبر کی لڑائی" میں اس تلمیح کا استعمال کیا ہے۔ قلعہ خیبر مدینہ منورہ سے تین سو بیس کلو میٹر دور ہے۔ قلعہ خیبر کی جنگ مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے لڑی گئی کیوں کہ آپؐ کو خبر ملی تھی کہ یہودی، قبیلہ غطفان کے ساتھ مل کر حملہ کریں گے۔ آپؐ نے لشکر تیار کیا اور ایک خاص علم نبوی حضرت علیؓ کو سونپ دیا یوں اس جنگ میں یہودیوں کو شکست ہوئی اور حضرت علیؓ کو فتح نصیب ہوئی۔

ان تاریخی تلمیحات کے علاوہ بھی سعدی شیرازی نے اسلامی تلمیحات کو بھی موضوع بحث لائے۔ ان اسلامی تلمیحات کے اثرات نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ سعدی شیرازی کی حکایت "انگوٹھی کا نگینہ "[۳۰] میں بیان ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکمرانی کا قصہ سنایا کہ ان کے پاس بیش بہا قیمتی نگینہ انگوٹھی میں لگا ہوا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا جب آپ کی رعایا قحط کا شکار ہو گئی۔ انھوں نے اپنی انگوٹھی بیچ دی۔ ان کے خیر خواہوں کو علم ہوا تو انھوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے قیمتی انگوٹھی بیچ ڈالی۔ اس پر عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ یہ بات مجھے گوارہ نہیں کہ رعایا تڑپ رہی ہو اور میں یہ نگینہ پہن کر بیٹھا رہوں۔ اس حکایت میں 'عمر بن عبدالعزیز' کی تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ یہ سلطنت اموی کے خلیفہ تھے۔ ان کے عہد میں مدینہ شریف کے اطراف میں مساجد بنی۔ علاوہ ازیں سرائے، کنویں اور راستے تعمیر کروائے۔ نہ صرف یہ بلکہ تبلیغ اسلام کو فروغ ملا اور عوام کی فلاح و بہبود کا کام بھی ہوا۔

سعدی شیرازی کی حکایت "دانائی کی بات "[۳۱] میں عرض کیا ہے۔ حکیم لقمان ایک روز بغداد کے بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کو اپنا مفرور غلام سمجھ کر پکڑ لیا اور اپنے گھر کے تعمیری کام پر لگا دیا۔ ایک سال بعد وہ مفرور غلام واپس آیا تو اس نے آپ کو اس حالت میں دیکھا (مفرور حکیم لقمان کو جانتا تھا) اور قدموں میں گر گیا۔ اس کے مالک کو ان کی قدر و منزلت کا علم ہوا تو اس نے بھی معافی مانگی۔ اس پر حکیم لقمان نے فرمایا! اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ دانائی کی بات سیکھی۔ وہ یہ کہ کسی کو کم درجہ سمجھ کر اسے مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ مجھے اب علم ہوا کہ یہ کام کتنا مشقت طلب اور جسمانی تکلیف کا باعث ہے۔ میرا بھی ایک غلام ہے میں اس سے اسی طرح کا کام لیتا تھا۔ آئندہ میں اس سے یہ خدمت نہیں لوں گا۔ اس حکایت میں 'حکیم لقمان' کی تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ یہ اپنی حکمت و دانائی اور نصیحتوں کی بدولت مشہور ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ سے خاص محبت تھی۔ ان کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے اور سورۃ لقمان انھی سے منسوب ہے۔

سعدی شیرازی اپنی ایک اور حکایت "بد آواز قوال "[۳۲] میں فرماتے ہیں کہ میرے استاد ابوالفرج بن جوزی قوالی سننے کے مخالف تھے۔ جسے لوگ سماع یعنی روحانی ترقی کے لیے اہم سمجھتے ہیں۔ نوعمری کے جذبات کی

بدولت میں اپنے استاد کی نصیحت کو نظر انداز کر کے چھپ کر ایسی محافل میں چلا جاتا تھا۔ ایک روز میں سماع کی محفل میں گیا تو وہاں پر قوال کی آواز بہت بری تھی۔ محفل میں موجود لوگ اس کی آواز سے تنگ ہو رہے تھے۔ میرا دل بھی کیا کہ محفل چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن یہ آداب محفل کے خلاف تھا۔ اللہ اللہ کر کے اس نے گانا ختم کیا۔ لوگوں نے تعریف تو نہ کی لیکن انعام دیا۔ میں (سعدیؒ) بھی آگے بڑھا اور اسے اپنا عمامہ اور دینار دے کر گلے ملا۔ حاضرین محفل یہ معاملہ دیکھ کر حیران ہوئے اور ایک شخص نے سوال کیا؟ کہ آپ نے اسے اتنی عزت دی۔ اس کو آج تک چاندی بھی کسی نے نہ دی۔ اس پر سعدیؒ نے فرمایا: میرے استاد ابن جوزی نے مجھے ایسی محافل پر جانے سے کئی بار منع کیا لیکن میں نے ان کی کبھی نہیں سنی، لیکن آج اس آواز کو سن کر میرا دل بدل گیا اور آئندہ میں ایسی محفلوں میں نہ آؤں گا۔ اس حکایت میں "ابوالفرج بن جوزی" کی تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ ابو الفرج ابن الجوزی کا لقب جمال الدین تھا۔ انھیں قرآن و حدیث اور تفسیر میں اس قدر شہرت حاصل تھی کہ ان موضوعات پر ڈھائی سو کتب لکھ ڈالی۔ اپنے عہد کے عالم و فاضل شخصیت مانے جاتے تھے۔ ان کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ ان کے غسل کا پانی اس برادہ سے گرم کیا جائے جو احادیث لکھتے ہوئے جمع کیا گیا۔

سعدیؒ نے اپنی ان حکایات کے علاوہ بھی بہت سی اسلامی تلمیحات استعمال کی ہیں۔ ان میں "حضرت یزید بسطامی" کی تلمیح کا تذکرہ کیا ہے۔ جو صوفی تھے اور تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے۔ "حضرت جنید بغدادی" کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔ یہ بھی صوفی تھے۔ "حاتم طائی" یہ شاعر تھے اور اپنے اعلیٰ اخلاق و سخاوت کی بدولت معروف و مقبول تھے۔ "حضرت موسیٰ" جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔ آپ کی پرورش فرعون کے گھر ہوئی۔ "حضرت یعقوبؑ" اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ حضرت یوسفؑ آپ کے بیٹے تھے۔ ان کی جدائی میں رو رو کے حضرت یعقوب کی بینائی چلی گئی تھی۔ "حضرت یحییٰ" اللہ تعالیٰ کے خاص نبی تھے۔ ان کا نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھا۔ آپ نیک خو اور صالح انسان تھے۔ ان کے علاوہ "حضرت موسیٰ" اور "شیخ عبدالقادر جیلانی" جیسی تلمیحات بھی شامل ہیں۔ یہ وہ تمام اسلامی تلمیحات ہیں جو سعدی شیرازی نے اپنی حکایات میں استعمال کی ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو سعدیؒ کی اسلامی تلمیحات کے اثرات نظیر اکبر آبادی کے شعری کلام میں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی غزلیات اور منظومات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لن ترانی نے کیا اپنا ظہور آخر کار
موسیٰ بیخود ہوئے اور جل گیا کوہ طور آخر کار[۳۳]

موسیٰ کے تئیں گو شجر طور کی سوجھی
پر ختم رسالت کو بہت دور کی سوجھی

غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے
موسیٰ کو بھلا کہیئے تو کیا طور کی سو جھی[۳۴]

تلمیح: غزل کے ان اشعار میں "کوہ طور" کی تلمیح مستعمل ہے۔ یہ ایک پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی دکھائی۔ آپ اس کو برداشت نہ کر سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ یہ پہاڑ جل کر سرمے کی طرح سیاہ ہو گیا۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

ایک دن آگے خلیل اللہ کے اک شخص نے
یک بیک آکر لیا منھ سے جو نام اللہ کا
اس خلیل اللہ نے سنتے ہی آکر شوق میں
سب دیا اس کو جو تھا اسباب عزہ و جاہ کا[۳۵]

تلمیح: نظیرؔ نے غزل کے ان اشعار میں "خلیل اللہ" کی تلمیح تحریر کی ہے۔ حضرت ابراہیم وہ پہلے نبی ہیں۔ ان کو خلیل اللہ کہہ کر پکارا گیا۔ ان مثالوں کے علاوہ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

فرعون نے کیا تھا جو عویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا بر ملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی[۳۶]

تلمیح: نظیرؔ کی نظم "آدمی نامہ" کے ان اشعار میں "فرعون"، "شداد"، "نمرود" کی تلمیح استعمال ہوئی ہیں۔ "فرعون" مصر کا بادشاہ، جس نے نعوذ باللہ خود کو خدا کے برابر سمجھتا تھا۔ یہ رسالت کی نشانیوں سے منکر ہوا۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بچا کر لے گئے اور یہ طوفان میں غرق ہو گیا۔ "شداد" یہ سرکش آدمی تھا۔ اس نے عارضی جنت بنا کر نعوذ باللہ خدا کا مقابلہ کیا۔ لیکن یہ جنت اللہ کے حکم سے تباہ ہو گئی۔ "نمرود" نعوذ باللہ خدائی کا دعویٰ کرنے والا، حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکوا دیا لیکن وہ آگ اللہ کے حکم سے ٹھنڈی ہو گئی اور حضرت ابراہیمؑ محفوظ رہے۔ اس کے علاوہ اس نظم میں "غوث"، "ابدال"، "قطب" اور "ولی" جیسی تلمیحات کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

ثوابت اس نے بنائے ہیں اس قدر سیار
کہ روز حشر تلک ہو سکے نہ جن کا شمار

مگر یہ نام ہیں ان کے جو سات ہیں سیّار
یہ دو ہیں شمس و قمر،اور ساتھ ان کے یار
عطارد و زحل و زہر ،مشتری ،بہرام [۳۷]

تلمیح: نظیرؔ کی نظم "توکار جہاں" کے اس بند میں "روز حشر" کی تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ یہ فانی دنیا جب ختم ہو گی۔ اس کے بعد روز حشر کا دن آئے گا۔ جب سب مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان سے نامہ اعمال کا حساب لیا جائے گا۔

نظیر اکبر آبادی کے شعری کلام پر سعدیؒ کی اسلامی تلمیحات کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ جن کا اوپر تذکرہ مثالوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ نظیرؔ کی ان اسلامی تلمیحات کے علاوہ بھی بے شمار تلمیحات ایسی ہیں، جو ان کی منظومات اور غزلیات میں ملتی ہیں ۔ان میں "عسکری مہدی امام"، "جعفرؑ"، "کاظمؑ "، "حضرت عیسیٰؑ"، "آدم"، "حرم"، "جنت"، "سلیم چشتی" اور "گنج بخش" وغیرہ شامل ہیں۔ نظیرؔ کے شعری کلام میں تلمیحات کے استعمال سے ان کی تحریر خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کا بھی اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس سے قاری ان کے کلام کو دلچسپی سے پڑھتا ہے اور ان اسلامی واقعات کے متعلق اسے آگاہی بھی ہو جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر سعدیؒ کی اسلامی تلمیحات کے نمایاں اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ نظیرؔ نے سعدیؒ سے متاثر ہو کر انتہائی خوبصورت تلمیحات کو زیر بحث لائے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے تلمیحات کو اتنے سلیقہ اور شگفتگی سے برتا ہے ۔کہ ان کا کلام پر لطف اور پر مغز نظر آتا ہے۔ المختصر اس باب میں اسلوب اور تلمیح کا تعارف کروایا ہے۔ مزید بر آں سعدیؒ اور نظیرؔ کے کلام میں جو اسلوبیاتی مطابقت پائی جاتی ہے اس کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ دونوں کے کلام میں سادہ بیانی کے متعلق مصنفین کی آراء پیش کی گئی۔ کس طرح سعدیؒ کے اسلوب نے نظیرؔ کو متاثر کیا ہے؟ جو سادہ گوئی اور اندازہ تکلم سعدیؒ نے اپنے اسلوب میں اختیار کیا ہے۔ نظیرؔ نے بھی اپنے انداز نگارش میں یہی روش منتخب کی ہے، نہ صرف یہ بلکہ نظیر اکبر آبادی نے اسی طرح کی تلمیحات کا ستعمال کیا ہے جو سعدی شیرازی کے کلام میں نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ اکسفورڈ انگریزی اور ہسپانوی لغت، style، ملاحظہ تاریخ ۲/۸/۵، بوقت ۱۰:۰۰۔

https://www.lexico.com/definition/style

۲۔ علی رفاد فتحی، ساخت اور اسلوب (دہلی: عفیف پرنٹرس، ۲۰۱۶ء)۔ ص ۱۳۳۔

۳۔ فرحت اللہ بیگ، زبان ،اسلوب اور اسلوبیات (علی گڑھ: ادارہ زبان واسلوب، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۵۸۔

۴۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۸۔

۵۔ شیخ سعدی شیرازی، گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی (لکھنؤ: مطبع کمار واقع، ۱۹۷۹ء)، ص ۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۹۔

۷۔ عبدالباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی (لکھنو: نول کشور پریس، ۱۹۵۱ء)، ص ۴۶۵۔

۸۔ عبدالغفور شہباز، زندگانی بے نظیر (لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۹۰۰ء)، ص ۲۲۱۔

۹۔ شیخ سعدی شیرازی، گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی، ص ۲۷۔

۱۰۔ عبدالباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۶۱۵۔

۱۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو مترجم محمد عسکری (لکھنؤ: مطبع منشی تیج کمار، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۹۳، ۲۹۲۔

۱۲۔ مخمور اکبر آبادی، روح نظیر (لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۱۔

۱۳۔ مخمور اکبر آبادی، نظیر نامہ (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۷۹ء)، ص ۸۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۱۵۔ شیخ سعدی شیرازی، گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی، ص ۹۸۔

۱۶۔ عبدالباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۴۵۸۔

۱۷۔عبدالباری آسی،تذکرہ خندہ گل(لکھنؤ:نگار مشین پریس،۱۸۲۹ء)،ص۴۲۸۔

۱۸۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۴۷۲۔

۱۹۔ایضاً،ص۳۸۰۔

۲۰۔شیخ سعدی شیرازی،گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی،ص۹۶۔

۲۱۔اردو لغت تاریخی اصول پر،تاریخ ملاحظہ ۱۵جولائی ۲۰۲۱۔

تلمیح http://udb.gov.pk/result.php!search

۲۲۔محمود نیازی،تلمیحات غالب(نئی دہلی:غالب اکیڈمی نظام الدین۔۱۹۷۲ء)،ص۱۰۔

۲۳۔نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی(کراچی:فیروز سنز،س۔ن۔)،ص۶۰۔

۲۴۔ایضاً،ص۲۹۔

۲۵۔ایضاً،ص۶۵۔

۲۶۔ایضاً،ص۱۴۔

۲۷۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۲۶۔

۲۸۔ایضاً،ص۶۳۔

۲۹۔ایضاً،ص۳۹۶۔

۳۰۔نظر زیدی،حکایات بوستان سعدی(کراچی:فیروز سنز،س۔ن۔)،ص۱۶۔

۳۱۔ایضاً،ص۱۰۲۔

۳۲۔نظر زیدی،حکایات گلستان سعدی،ص۸۱۔

۳۳۔عبدالباری آسی،کلیات نظیر اکبر آبادی،ص۸۶۔

۳۴۔ایضاً،ص۱۴۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۸۳۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۷۔

ماحصل

فکر ایسا رجحان ہے ۔جس میں انسان غور وغوض کرتا ہے اور اپنے تخیلات و نظریات کو پروان چڑھاتا ہے۔یعنی فکری اساس ایسی کیفیت ہے جس میں انسان اپنی سوچ و بچار، عقل و فہم اور ادراک سے کام لیتا ہے۔یہ فکری رجحان مماثل اور مخالف ہو سکتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور سعدی شیرازی کے کلام میں اخلاقی و سماجی اقدار کے حوالے سے کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ گو کہ سعدیؒ اور نظیرؔ کے مابین زمانی بعد حائل ہے۔لیکن سعدیؒ کے فکری اثرات نے ان کی شاعری کو شعوری اور لا شعوری طور پر متاثر کیا ہے۔جس طرح سعدیؒ نے اپنی گلستان و بوستان میں پند و نصیحت کی اور رعایا کے اخلاقی و سماجی قدروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حاکم کو جھنجھوڑا۔بالکل ایسے ہی نظیرؔ نے بھی اپنے کلام میں روز مرہ کے حالات وواقعات اور معمولات زندگی وغیرہ کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔در حقیقت انھوں نے عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ان کا انداز بیان اور فکر و نظر عامیانہ ہے اور نظیرؔ کا شعری کلام اپنے موضوعات کے اعتبار سے عوامی بائیں ہمہ اخلاقی و سماجی موضوعات کی شاعری ہے۔سعدیؒ کی شاعری بھی اپنے مزاج اور موضوعات کے اعتبار سے عوامی فلہذا اخلاقی و سماجی اقدار کی عکاس ہے۔یہ وہ بنیادی وجہ ہے جو شیخ سعدیؒ اور نظیرؔ میں ایک خاص قسم کی مطابقت پیدا کر دیتی ہے۔اس مقالے میں اسی مطابقت کی جزئیات کا مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ جاننے کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ نظیر اکبر آبادی نے شیخ سعدی کے فکری، اخلاقی اور تخلیقی کام سے کس طرح استفادہ کیا اور کس قسم کے اثرات قبول کیے گئے ہیں؟ ان تمام غایت کے حصول کے لیے نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ کو موضوع تحقیق لایا گیا ہے۔موضوع کی ضرورت و اہمیت کے اعتبار سے ہماری تحقیق درج ذیل سوالات پر منحصر ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے کلام میں شیخ سعدی کے اخلاقی و سماجی اوصاف کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟ نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کیا ہیں؟

ان سوالات کے پیش نظر نظیرؔ اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدیؒ کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔سعدیؒ کے فکری اثرات کے تناظر میں نظیرؔ کی شاعری کو پرکھا گیا ہے اور حتیٰ الامکان یہ سعی کی گئی کہ ان سوالات کی روشنی میں تشفی بخش جوابات دیئے جا سکیں۔اس تحقیقی مقالے میں "نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر شیخ سعدی کے فکری اثرات کا خصوصی مطالعہ" میں نظر زیدی کی ترجمہ شدہ کتابوں حکایات گلستان سعدی اور حکایات بوستان سعدی کے سماجی و اخلاقی اقدار کے فریم ورک کا اطلاق کیا گیا ہے۔ نظیرؔ کے شعری کلام پر فریم ورک کے عناصر ترکیبی کے اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔یعنی نظیرؔ کی منظومات اور غزلیات کو سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی اقدار کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔سعدیؒ کی حکایات میں جو سماجی و اخلاقی رجحان موجود

ہے۔اس نے نظیرؔ کی شاعری کو کیسے متاثر کیا ہے؟ اسی نکتے کو محور و مرکز بناتے ہوئے یہ تحقیقی کام سر انجام دیا گیا ہے۔

باب اوّل میں شاعری کے معنی، تعریف، شاعری کی ابتداء، اس کی ترویج و ترقی میں مختلف رجحانات و تحریکات کے اثرات اور شاعری کے موضوعات میں تبدل کو زیر بحث لاتے ہوئے سعدیؒ کی شخصیت، اخلاقی تصورات اورگلستان و بوستان کا مختصر اًتذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز نظر زیدی(ان کا اصل نام نظر حسین تھا۔۱۹۱۷ء کلہیڑی بجنور بھارت میں پیدا ہوئے۔ یہ اردو ادب کے ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ تاجور نجیب آبادی ان کے استاد تھے ۔انھوں نے نور علی نور نعتیہ مجموعہ، حکایات خلفائے راشدین، مہکتے پھول، نوائے خامہ جیسی کتب لکھ کر اردو ادب کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالا ہے)کی ترجمہ شدہ کتابوں حکایات گلستان سعدی ا ورحکایات بوستان سعدی کے سماجی و اخلاقی اقدار کا فریم ورک بنایا گیا ہے۔ اس فریم ورک یا طریقہ تحقیق کے عناصر درج ذیل ہیں: اخلاقی اقدار میں حقوق العباد، عدل و انصاف، صبر و تحمل، اطاعت، عجز و انکساری، نیکی، تقویٰ وغیرہ جبکہ سماجی اقدار میں سیاست، غربت، غیبت، ریاکاری، ذات پات، چغل خوری، غرور و تکبر، دنیاوی مال و زر، ظلم شامل ہیں۔ اس کے تحت آگے چل کر نظیرؔ کی منظومات اور غزلیات پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔ بعد ازاں اردو ادب کے شعراء پر سعدیؒ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان شعراء میں علامہ اقبال، میر درد، میر تقی میر اور نظیرؔ وغیرہ کی شاعری کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اردو ادب میں سعدیؒ کی شخصیت اور فن پر جو کتب، رسائل، تراجم اور اخبارات میں مضمون لکھے گئے ہیں۔ ان کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ المختصر اس باب میں اردو ادب پر سعدیؒ کے کلام کے اثرات اور ان کی شخصیت پر مختلف لوگوں کے تحقیقی کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم میں تین نکات پر بات چیت کی گئی ہے۔ نظیرؔ کی مختصر سوانح حیات، اردو ادب میں نظیرؔ کی شخصیت و فن پر تحقیقی کام کا جائزہ نظیرؔ کی منظومات پر سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات یعنی باب دوم "نظیر اکبر آبادی کی منظومات پر شیخ سعدی کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات" میں نظیرؔ کے حالات زندگی کا مختصر تعارف کروایا گیا ہے۔ نظیرؔ اردو ادب میں اپنی محنت و لگن کی بدولت ایک اہم مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ ابتداء میں انھیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ حقدار تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انھیں اردو ادب میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ نظیرؔ رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کو مال و دولت سمیٹنے کا بالکل لگاؤ نہ تھا۔یعنی انھوں نے اپنی ساری زندگی سادگی سے گزار دی۔ ان کی شاعری کا دارومدار زندگی کے عام پہلوؤں پر تھا یعنی انھوں نے سماجی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی رسومات کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری معیاری اصول اخلاق کی پاسداری کرتی ہے اور انھوں نے عوامی جذبات و احساسات کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔ بعد ازاں اردو ادب میں نظیرؔ کی شخصیت و فن پر

موجود کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت پر بہت سے مضامین رسالہ "زمانہ"، "نگار" اور تاریخی کتب میں درج ہیں۔ ان کے شعری کلام کو مختلف مصنفین نے مرتب کیا ہے۔ ان سب کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں نظیرؔ کی منظومات (تلقین توحید، رہے نام اللہ کا، چڑیوں کی تسبیح، حقیقی کارساز، تن کا جھونپڑا، بنجارا نامہ اور شہر آشوب وغیرہ) پر سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات کا جائزہ مثالوں کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

باب سوم "نظیر اکبر آبادی کی غزلوں پر شیخ سعدی کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات" میں غزل نگاری کے معنی کیا ہے؟ اس کی تعریف، ہیت، وزن اور بحر، غزل کے موضوعات میں تبدل، عہد زریں میں نظیرؔ کے ہم عصر شعراء، غزل کا پس منظر، نظیرؔ کا غزل پردازی کی صنف میں مقام و مرتبہ وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ نظیرؔ کو سب ان کی منظومات کی وجہ سے جانتے ہیں جبکہ اس باب میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ انھوں نے نہ صرف نظم نگاری کی بلکہ غزل کے میدان میں بھی اپنا ایک منفرد انداز سے قلم چلایا ہے۔ بعد ازاں نظر زیدی کے کتب سے تیار کردہ طریقہ تحقیق یا فریم ورک کو لکھتے ہوئے نظیرؔ کی غزلیات، ان میں (اسی کی ذات کو ہے دائم وثبات، گر عیش میں عشرت میں کٹی رات تو پھر کیا، ہو کیوں نہ تیرے کام میں حیران تماشا، ہر آن تمھارے چھپنے سے ایسا ہی اگر دکھ پائینگے ہم، ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی جیسے، کیا کہیں دنیا میں ہم انسان یا حیوان تھے وغیرہ) پر سعدیؒ کے مذہبی، سماجی و اخلاقی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں نظم کیا ہے؟ اس کی تعریف اور نظیر کی شاعری کو موضوع بحث لاتے ہوئے محاکات اور منظر کشی کی تعریف، نظیرؔ کی منظومات میں محاکات اور منظر کشی وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ نظیرؔ کی برسات اور پھسلن، برسات کی اومس، برسات کی بہاریں، برسات کا لطف، جاڑے کی بہاریں، آدمی نامہ، مفلسی، تل کے لڈو وغیرہ جیسی منظومات محاکات اور منظر کشی کی بہترین مثالیں ہیں۔ نظیرؔ نے ان منظومات کی تصویر کشی اس قدر دلکش انداز میں کی ہے کہ سامنے والا اس تصور میں کھو جاتا ہے اور اسے وہ حقیقی عکس معلوم ہونے لگتا ہے۔

باب پنجم میں بیان کیا گیا ہے کہ نظیرؔ کی منظومات اور غزلیات پر نہ صرف سعدی شیرازی کے اخلاقی و سماجی اقدار کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بلکہ سعدیؒ اور نظیرؔ کے اسلوب میں مماثلت کا اندازہ چند ایک نکات سے لگایا گیا ہے ان میں:

۱۔ دیگر مصنفین کی آراء کی روشنی میں ان دونوں شخصیات کے کلام میں سادہ گوئی کو بیان کیا گیا۔

۲۔ سعدیؒ اور نظیرؔ کے عہد میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے گو کہ ان کے درمیان زمانی بعد حائل ہے باوجود اس کے ان کے شعری کلام میں اپنے اپنے دور کی بدحالی کا ذکر کیا گیا جس کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔

۳۔ ان دونوں کے ہاں اخلاقی قدریں بھی مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے سعدیؒ نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور توکل کا درس دیا بالکل ایسے ہی نظیرؔ نے بھی اپنے شعری کلام میں ان کو پیش کیا ہے۔

۴۔ علاوہ ازیں ان کے اسلوب بیان میں مماثلت کی ایک اور وجہ ان کی تلمیحات ہیں۔ جس طرح سعدیؒ نے اپنے عہد کی اسلامی اور تاریخی تلمیحات کو بیان کیا بالکل ایسے ہی نظیرؔ بھی سعدیؒ سے اثرات قبول کرتے ہوئے اپنے دور کی اسلامی اور تاریخی تلمیحات کو اپنی شاعری میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

۵۔ سعدیؒ اور نظیرؔ میں ایک اور قدر مشترک ہے اور وہ ان کا عوامی رنگ ہے۔ جس طرح یہ دونوں عوام سے مخاطب ہوئے اور ان کے حال کو بیان کیا بہت کم یا شاذ و نادر ہی ایسے شخصیات ملتی ہیں جو عوام سے جڑے ہیں۔ اور ان کے دکھ درد کو سمجھے۔

نظیرؔ اور سعدیؒ میں جہاں بہت سی قدریں مشترک ہیں وہاں ان میں انفرادی رنگ بھی موجود ہے اور وہ ان کی جزئیات نگاری اور عاشقانہ تلمیحات ہیں۔ جس سے نظیرؔ نے اس قدر خوبصورتی سے کام لیا ہے جو انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ المختصر نظیرؔ کے شعری کلام میں سعدیؒ کے اسلوب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ نظیرؔ نے اپنی شاعری میں محاورات، اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں سعدیؒ کی سی فصاحت و بلاغت، سادگی و سلاست، صنائع بدائع، تصنع و تکلف، سجع گوئی، مرقع اور مرصع سازی کو اپنی انداز نگارش کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے ہر ایک پہلو کو قلم بند کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس باب میں تلمیح کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے نظیر پر سعدیؒ کی اسلامی و تاریخی تلمیحات کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں حجاج بن یوسف، سکندر رومی، سلطان محمد سبکتگین، تاتاری اور بادشاہ نوشیرواں، حکیم لقمان، حاتم طائی اور حضرت جنید بغدادی وغیرہ جیسی اسلامی و تاریخی تلمیحات کو بیان کیا گیا ہے۔

نظیرؔ کی شاعری پر سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی اثرات کا مطالعہ پیش کیا۔ ابتدا سے دور حاضر تک اخلاقیات کا دائرہ کار انسانی زندگی کا ایک اہم جز رہا ہے۔ ہر دور (چاہے وہ قدیم ہو یا جدید) میں سماجی و اخلاقی اقدار کا مطالعہ معاشرے کی ترقی میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ سعدی شیرازی کی تحریروں میں ہمیں سماجی و اخلاقی اقدار کا رنگ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف گلستان و بوستان ان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی تخلیق کی عمدہ مثال ہیں۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو کسی بھی معاشرے میں اس کی ثقافت، معیشت، تصورات، مذہب، حب الوطنی اور ذات پات کے نظام وغیرہ کی حفاظت اخلاقی بالادستی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اخلاقی اقدار کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں سعدیؒ اور نظیرؔ کے شخصیت و فن پر بات کرتے ہوئے نظیرؔ کے شعری کلام پر سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی

اقدار کا جائزہ لیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان دونوں شخصیات کے اسلوب، محاکات اور منظر کشی کا مطالعہ بھی پیش کیا گیا۔ المختصر اس تحقیقی مقالے میں یہ کاوش کی گئی کہ سعدیؒ کے سماجی و اخلاقی اثرات کی روشنی میں نظیرؔ کی غزلیات اور منظومات کا جائزہ پیش کیا گیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس مقالے میں نظیرؔ کی شاعری پر سعدیؒ کے فکری اثرات کا جائزہ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان دونوں شخصیات کے درمیان زمانی بعد حائل ہے۔ باوجود اس کے نظیرؔ کی شاعری پر سعدیؒ کے واضح اثرات نظر آتے ہیں اور مماثلت کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ نظیرؔ کا کلام سعدیؒ کے فکر کا پرتو ہے۔ ان دونوں نے جس طرح فکری اثرات کو برتا ہے یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں شخصیات کے شعری کلام میں سماجی و اخلاقی اقدار کو پیش کیا گیا۔ اگرچہ سعدیؒ کی شخصیت کے اثرات اردو ادب پر بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر نظیر اکبر آبادی نے شعوری اور لاشعوری اعتبار سے سعدیؒ کی فکر کو اپنایا ہے۔ اس لیے ہمیں نظیرؔ کی منظومات (آدمی نامہ، بنجارا نامہ، تن کا جھونپڑا، تلقین توحید اور تسلیم و رضا وغیرہ) میں سعدیؒ کا رنگ نظر آتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان دونوں شخصیات کے اسلوب، محاکات، منظر کشی اور تلمیحات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نظیرؔ نے شعوری اور لاشعوری طور پر سعدیؒ کی شخصیت سے متاثر تھے اور ان کے شعری کلام میں سعدیؒ کی فکری اثرات دیکھے جا سکتے ہیں جو اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

کتابیات

آبادی، نظیر اکبر۔نظیر فہمی جلد دوم مرتبہ شمس الحق عثمانی۔ دہلی: کتاب گھر، ۲۰۱۶ء۔

آسی، عبد الباری۔تذکرہ خندہ گل۔ لکھنؤ: نگار مشین پریس، ۱۸۲۹ء۔

آسی، عبد الباری۔کلیات نظیر اکبر آبادی۔ لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۹۵۱ء۔

احمد، توقیر۔اقبال کی پیکر تراشی۔ نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس پٹوری ہاؤس دریا گنج، ۱۹۸۹ء۔

احمد، ریاض۔تنقید سرسید کے دور میں۔لاہور: بہترین ادب مکتبہ اردو، ۱۹۵۲ء۔

احمد، کلیم الدین۔اردو شاعری پر اک نظر۔پٹنہ: دی قومی پریس لمیٹڈ، س۔ن۔

احمد منیری، شمس الدین۔ اشعار نظیر۔الہ آباد: لالہ رام نرائن لعل بک سیلر، ۱۹۴۰ء۔

اختر اورینوی، اختر احمد۔مطالعہ نظیر۔پٹنہ: دی آزاد پریس سبزی باغ، ۱۹۶۱ء۔

اختر، وحید۔خواجہ میر دردتصوف اور شاعری۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۱ء۔

ارسطو۔شعریات مترجم شمس الرحمن فاروقی۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۱۹۹۸ء۔

اعظمی، پرویز احمد۔اردو میں سیاسی شاعری کی ادبی قدر و قیمت ۱۹۰۰ء۔۱۹۵۰ء۔ دہلی: نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹر، ۲۰۰۹ء۔

اقبال، علامہ۔کلیات اقبال اردو۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء۔

اکبر آبادی، مخمور۔روح نظیر۔ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۷۸ء۔

اکبر آبادی، مخمور۔نظیر نامہ۔ کراچی: آفسیٹ پریس، ۱۹۷۹ء۔

الرحمن، عبد۔مراۃ الشعر۔ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۷۸ء۔

الحق، ممتاز۔اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء۔

بزدار، شیر محمد۔اقبال اور سعدی کا فلسفہ اخلاق تحقیقی جائزہ۔ایم فل اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء۔

بیگ، مرزا فرحت اللہ۔دیوان نظیر اکبر آبادی۔دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۶ء۔

بیگ، فرحت اللہ۔زبان ،اسلوب اور اسلوبیات۔علی گڑھ: ادارہ زبان واسلوب، ۱۹۸۳ء۔

پاریکھ، رؤف۔اردو لغت تاریخی اصول پر (جلد بیستم) کراچی: اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۵ء۔

حالی، مولانا الطاف حسین۔حیات سعدی۔دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء۔

حالی، الطاف حسین۔مقدمہ شعر و شاعری۔نئی دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ، ۲۰۰۷ء۔

حسن، محمد۔نظیر اکبر آبادی۔مترجم یامین پرویز۔دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۶ء۔

حسین، احمد۔حالات سعدی۔لاہور: خادم التعلیم پریس، ۱۸۹۵ء۔

حسین، قاضی سجاد۔بوستان سعدی۔دہلی: سب رنگ گھر، ۱۹۵۵ء۔

خاں، مسعود حسین۔انتخاب منظومات نظیر اکبر آبادی۔لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء۔

دہلوی، سید احمد۔فرہنگ آصفیہ (جلد سوم)۔لاہور: زین نعمان پرنٹرز، ۲۰۱۵ء۔

رشید، غلام آسی۔اردو غزل کا تاریخی ارتقا۔نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۶ء۔

زیدی، نظر۔حکایات بوستان سعدی۔لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، س۔ن۔

زیدی، نظر۔حکایات گلستان سعدی۔کراچی: فیروز سنز، س۔ن۔

سعدی، مصلح الدین۔کریما۔لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۸۸۴ء۔

سعید، طارق۔اسلوب اور اسلوبیات۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

سکسینہ، رام بابو۔تاریخ ادب اردو مترجم محمد عسکری۔لکھنؤ: مطبع منشی تیج کمار، ۱۹۹۹ء۔

سلام سندیلوی، سلام۔اردو شاعری میں منظر نگاری۔لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۸ء۔

شہباز، عبدالغفور۔ زندگانی بے نظیر۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء۔

شیرازی، شیخ سعدی۔ حکایات سعدی دلچسپ و نصیحت آموز مرتبہ طالب ہاشمی۔ دہلی: دارالاشاعت مصطفائی، ۲۰۱۰ء۔

شیرازی، شیخ سعدی۔ گلستان۔ لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۸۸۰ء۔

شیرازی، شیخ سعدی۔ گلستان مترجم مترجم عبدالباری آسی۔ لکھنؤ: مطبع کمار واقع، ۱۹۷۹ء۔

صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ۔ ادبی اصطلاحات کا تعارف۔ لاہور: اسلوب، ۲۰۱۵ء۔

صدیقی، ابواللیث۔ نظیر اکبر آبادی: ان کا عہد اور شاعری۔ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء۔

عثمانی، شمس الحق۔ نظیر فہمی۔ دہلی: دہلی کتاب گھر، ۲۰۱۶ء۔

فاطمی، علی احمد۔ نظیر اکبر آبادی۔ لکھنؤ: نصرت پبلیشرز، ۱۹۸۳ء۔

فتحی، علی رفاد۔ ساخت اور اسلوب ۔ دہلی: عفیف پرنٹرس، ۲۰۱۶ء۔

قدوائی، صدیق الرحمن۔ نظیر اکبر آبادی ایک منفرد شاعر۔ نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۱۰ء۔

قریشی، شریف احمد۔ فرہنگ روح نظیر۔ دہلی: جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، ۱۹۸۹ء۔

کاشمیری، حامدی۔ انتخاب کلام۔ دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۲ء۔

کنول، ابن۔ نظیر اکبر آبادی کی منتخب شاعری۔ انڈیا: نیشنل بک ٹرسٹ، ۲۰۱۳ء۔

محمود نیازی، محمود۔ تلمیحات غالب۔ نئی دہلی: غالب اکیڈمی نظام الدین۔ ۱۹۷۲ء

نعمانی، شبلی۔ شعر العجم ۔ اعظم گڑھ: طبع گرد ید، ۱۹۸۳ء۔

نعمانی، شبلی۔ شعر العجم حصہ دوم۔ اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۸۸ء۔

نقوی، طلعت حسین۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۱ء۔

نقوی، طلعت حسین۔نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۰۰ء۔

نگار، سنبل۔اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء۔

نورانی، امیر حسن۔نظیر اکبر ابادی حالات زندگی اور انتخاب کلام۔ لکھنؤ: منشی نول کشور ، ۱۹۰۰ء۔